اکتوبر ۲۰۲۲ء

پاک جمہوریت

وزارت اطلاعات ونشریات کا جریدہ

جلد:62 شمارہ:07

پاکستان میں سیلاب کا تصویری خاکہ

اکتوبر ۲۰۲۲ء
پاک جمہوریت
وزارت اطلاعات ونشریات کا جریدہ
جلد:62 شمارہ:07

۱۔	ماحولیاتی بگاڑ.....خود کردہ را علاج نیست	اداریہ	۴
۲۔	۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کا زلزلہ	سمیرا اشرف	۵
۳۔	پولیو	محمد نواز طاہر	۱۳
۴۔	وزیراعظم کا قطر کا کامیاب دورہ	ظہیر احمد	۲۰
۵۔	پاکستان میں سیلاب نے تباہی مچادی..... بڑے پیمانے پر امدادی سرگرمیاں	محمد تنویر ہاشمی	۲۵
۶۔	صنفی تنوع، خواجہ سراء اور عوامی زندگی میں اُن کی شمولیت	امجد نذیر	۳۴
۷۔	پاکستان میں کھیلوں کی حالتِ زار پاکستان اور کامن ویلتھ گیمز	آفتاب احمد	۴۲
۸۔	ہنگامی بنیادوں پر زرعی اصلاحات کا فیصلہ	عابد گوندل	۴۶

نگران اعلیٰ: عمرانہ وزیر
نگران: ثمینہ فرزین
مینجنگ ایڈیٹر: شبیہہ عباس
چیف ایڈیٹر: عشرت اختر
ایڈیٹر: کنزہ اشرف
میگزین ڈیزائن: شہزاد انور

ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز،
291۔اے، ایم اے جوہر ٹاؤن لاہور
انتظامیہ: 042-35223278
مدیر: 042-35201008
mnlahore@yahoo.com

اداریہ

ماحولیاتی بگاڑ.....خود کردہ را علاج نیست

کرۂ ارض پر جب آدم کو اُتارا گیا تو اُسے عناصرِ فطرت سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا کہ بنی نوع آدم نے تا وقتِ قیامت یہاں رہنا تھا۔ قدرت نے انسان اور دیگر مخلوقات کے لیے ہر شے باافراط فراہم کر دی تھی۔ موسموں کی آمد و رفت کے سلسلے ہزار ہا سالوں سے فطری انداز میں چلتے آ رہے تھے کہ ایک دو صدی قبل انسان نے خام تیل زمین کھود کر نکالنا شروع کیا۔ اور آہستہ آہستہ تیل کا بطور ایندھن استعمال شروع ہو گیا۔ انسان نے قدرتی ماحول کی جگہ مصنوعی ماحول ایجاد کرنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً کرۂ ارض کا اوسط درجہ حرارت مثالی درجے سے اُوپر جانے لگا۔ رہی سہی کسر کلورو فلورو کاربن والی ریفریجریشن کی گیسوں نے پوری کر دی۔ جنہوں نے کرۂ ارض کی ماحولیاتی حفاظتی جھلّی یعنی اوزون کی تہہ میں شگاف ڈال دیئے۔ انسان کا پیدا کردہ ماحولیاتی بگاڑ اب اس مقام تک آ چکا ہے کہ عناصر فطرت کا اعتدال آخری دموں پر ہے۔ موسمیاتی سائیکل بُری طرح سے بے ترتیبی کا شکار ہو رہا ہے۔ سمندروں کی اوسط سطح میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جو کہ ایک نہایت تشویش ناک امر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کرۂ ارض کے لیے پانی کے ذخائر جو گلیشئرز کی صورت میں صدیوں سے محفوظ چلے آ رہے تھے، وہ لمحہ موجود میں تیزی سے پگھلنا شروع ہو چکے ہیں۔ اگر ہم نے ماحولیاتی انحطاط کو بڑھانے والی سرگرمیوں کو نہ روکا تو اندیشہ ہے کہ یہ میٹھے پانی کے ذخائر پگھل کر سیلابی صورت میں سمندروں کے کھارے پانی میں جا ملیں گے۔ اوزون کی تہہ کے شگاف کاربن کے ذرّات اور کلورو فلوروں گیسوں کے اخراج کے باعث یہاں تک بڑھ چکے ہیں کہ اندیشہ لاحق ہو رہا ہے کہ سورج کی روشنی کی الٹراوائلٹ کرنیں سیدھا زمین پر پڑا کریں گی۔ یہ بالائے بنفشی کرنیں حیات کے لیے بہت مضر ہیں۔ انسانوں اور دیگر اعلیٰ جانداروں میں ان سے کینسر کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں۔

بنی نوع آدم نے ڈیڑھ دو سو برس سے اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر کو برباد کیا ہے۔ اب تو یہ کیفیت ہے کہ ''ہم سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا''۔ انسان نے ٹھوس، مائع، گیس کی شکل میں زہریلا فضلہ اس قدر پیدا کیا ہے کہ اس کے نکاس کے لئے بھی سینکڑوں برس درکار ہوں گے۔ اس ساری عمومی کیفیت میں دُکھ کی بات یہ ہے کہ ماحولیاتی بگاڑ کا ۸۰ سے ۹۰ فیصد حصہ ۲۰۔ جی کے ممالک کا کیا دھرا ہے لیکن اس کی قیمت پاکستان اور خطے کے دیگر ممالک چکا رہے ہیں۔ پاکستان میں حالیہ سیلاب اور اس کے نتیجے میں ہونے والی وسیع تباہی ماحولیاتی تبدیلی کا نتیجہ ہیں۔ مغرب کے اندھا دھند صنعتی پھیلاؤ نے ماحول کو بُری طرح متاثر کیا ہے جس سے کرۂ ارض کے اوسط درجہ حرارت میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ ہمارا سیارہ اب تپنا شروع ہو گیا ہے۔ اس عالمی تپش کے ہولناک ماحولیاتی اثرات بالخصوص منطقۂ حارہ یعنی ٹراپیکل زون کے ممالک پر ظاہر ہوئے ہیں۔ ماحولیاتی سائنسدان تو بہت عرصے سے ان خدشات کا اظہار کر رہے تھے، تاہم اندیشوں کو حقیقت میں بدلتا دیکھ کر اب عالمی ادارے بھی چیخ اُٹھے ہیں کہ ہمیں کرۂ ارض کے ساتھ بدسلوکی بند کرنا ہو گی۔ ہمیں بھی اپنا گھر سیدھا کرنا ہے۔ اس سلسلے میں طویل اور قلیل مدت دونوں طرح کی پالیسیاں بنانا ہوں گی اور فاسل فیول پر انحصار کم سے کم کرنا ہو گا۔ وگرنہ، بصورتِ دیگر..... ہاتھوں سے لگائی گرہیں دانتوں سے کھولنا پڑتی ہیں۔

۸-اکتوبر ۲۰۰۵ء کا زلزلہ

سمیرا اشرف

دنیا میں قدرتی آفات سے ہمیشہ تباہی و بربادی ہوتی رہی ہے جس سے لاکھوں لوگ لقمۂ اَجل بنتے رہے،لیکن چند ایسی آفات بھی دنیا میں نمودار ہوئی ہیں جن سے بڑے پیمانے پر تباہی نے بستیوں کی بستیاں اور علاقوں کے علاقے اُجاڑ دیے اور چند لمحوں میں لاکھوں لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔قدرتی آفات میں زلزلہ ایسی آفت ہے جو کرۂ ارض پر جہاں بھی آتا ہے تباہی و بربادی ہی لاتا ہے۔دنیا میں ابھی تک کوئی ایسا نظام ایجاد نہیں ہوا جس سے زلزلہ کا پیشگی پتا چل سکے۔بیسویں اور اکیسویں صدی میں کئی تباہ کن زلزلے آئے جو لاکھوں جانوں کو لقمہ اَجل بنا گئے۔پاکستان بھی دنیا کے اُن ممالک میں شامل ہے جہاں اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں جن میں جانی اور مالی نقصان بھی ہوتا رہا ہے۔ گذشتہ پچھتر سالہ تاریخ میں کچھ ایسے ہی حادثات وسانحات رُونما ہوئے ہیں جو بھُلائے نہیں بھولتے،انہی میں سے ایک افسوس ناک سانحہ آج سے تقریباً سترہ سال پہلے ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو پیش آیا جسے یاد کر کے اب بھی دل غمزدہ اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔پاکستان اس وقت اپنی تاریخ

کے بدترین اور دنیا کے چوتھے بڑے زلزلے کا شکار ہوا تھا جس میں بے انتہا جانی اور مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

دنیا بھر کے حوالے سے زلزلوں کا مختصراً احوال یوں ہے: ۱۹۲۰ء میں چین میں زلزلہ آیا جس کے سبب دو لاکھ پینتیس ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں چین میں دو لاکھ افراد جان سے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں جاپان کے شہر کالاہاما میں ایک لاکھ چالیس ہزار لقمہ اجل بنے۔ ۱۹۳۵ء میں پاکستان کے شہر کوئٹہ میں ساٹھ ہزار افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ۱۹۸۰ء میں اٹلی کے زلزلہ میں ۸۳ ہزار افراد موت کے منہ میں گئے۔ ۲۰۰۱ء میں ہندوستان کے شہر گجرات میں چالیس ہزار افراد ہلاک ہوئے، ۲۰۰۴ء میں سونامی سے ہندوستان، انڈونیشیا، سری لنکا اور تھائی لینڈ میں دو لاکھ افراد لقمہ اَجل بنے تھے۔ اسی طرح ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء تاریخ کا تاریک دن ہے جب زلزلے نے پاکستان کو ہلا دیا۔

بروز ہفتہ، ماہ رمضان کا تیسرا دن بمطابق ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کی صبح، جب زندگی اپنے معمول پر تھی کہ اچانک آزاد کشمیر، مظفر آباد، باغ، وادی نیلم، چکوٹھی اور دیگر علاقوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ خوفناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ آنے والے زلزے نے ہر طرف تباہی مچادی۔ آزاد جموں وکشمیر اور صوبہ سرحد کی ۱۵ تحصیلیں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ ریکٹر سکیل پر زلزلے کی شدت ۶ء۷ تھی اور اس کا مرکز اسلام آباد سے ۹۵ کلومیٹر دُور اٹک اور ہزارہ ڈویژن کے درمیان تھا۔ ایک ہی جھٹکے میں لاکھوں مکانات زمین بوس ہوگئے۔ ایک لاکھ سے زیادہ افراد ملبے تلے دب کر جاں بحق ہوگئے۔ سوا لاکھ سے زیادہ زخمی ہوگئے جبکہ ۳۰ لاکھ افراد بے گھر ہوگئے۔ سات ہزار سے زیادہ تعلیمی ادارے اور تین ہزار آٹھ سو سینتیس کلومیٹر

طویل سڑکیں تباہ ہوگئیں۔سب سے زیادہ تباہی مظفر آباد میں ہوئی جہاں مکانات، سکول، کالج، یونیورسٹی، دفاتر، ہوٹل، ہسپتال، مارکیٹیں اور پلازے ملبے کا ڈھیر بن گئے۔ یہاں پچاس ہزار سے زیادہ افراد جاں بحق اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ پانچ لاکھ افراد گھروں سے سڑکوں پر آ گئے۔ زلزلے نے پڑوس میں افغانستان، بھارت اور مقبوضہ کشمیر کو بھی متاثر کیا جہاں ۱۴۵۰ افراد انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔

ایک محتاط تجزیے کے مطابق اس قیامت خیز زلزلے سے ۷۳ ہزار افراد لقمہ اَجل بنے جس میں ۲۰ ہزار بچے شامل تھے۔ایک لاکھ پچاس ہزار شدید زخمی ہوئے۔۲،۲۰،۰۰۰ بچے زلزلے سے براہِ راست متاثر جبکہ ۳،۳۰،۰۰۰ افراد بے گھر ہوئے۔ مجموعی طور پر ۱۲۸۰۰۰ اسکوائر کلومیٹر کا علاقہ زلزلے کی زد میں آیا جس نے ۴۰۰ گاؤں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ متاثرہ علاقوں میں ۱۶ ہزار سکول اور ۸۰ فیصد صحت کے مراکز مکمل طور پر تباہ ہوئے۔اسی طرح آزاد کشمیر کے چار اضلاع میں مجموعی طور پر ۲ لاکھ ۹۲ ہزار ۷۰۲ مکان تباہ ہوئے تھے۔سرکاری اداروں میں زیادہ نقصان سکول، کالج اور یونیورسٹی کا ہوا تھا۔

شدید زلزلے کے نتیجے میں سب سے زیادہ ہلاکتیں آزاد کشمیر اور پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواہ میں ہوئیں، جہاں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق کل ہلاکتیں ۷۴،۶۹۸ تھیں۔ یہ ہلاکتیں ۱۹۳۵ء میں ہونے والے کوئٹہ کے زلزلے میں کہیں زیادہ تھیں۔ بھارتی جموں و کشمیر میں کل ۱۴۰۰ لوگ ہلاک ہوئے، جس کی تصدیق بھارتی حکومت نے کی۔ عالمی امدادی اداروں کے مطابق اس زلزلے میں کل ۸۶،۰۰۰ لوگ جاں بحق

ہوئے۔

زیادہ ہلاکتیں سکولوں اور ہلاک ہونے والوں میں بڑی تعداد بچوں کی بتائی جاتی ہے۔ زیادہ تر بچے منہدم ہونے والی سکول کی عمارتوں کے ملبے تلے دب گئے۔ تفصیلی رپورٹوں کے مطابق شمالی پاکستان میں جہاں یہ زلزلہ رُونما ہوا، قصبے اور گاؤں صفحۂ ہستی سے تقریباً مٹ گئے۔ جبکہ مضافاتی علاقوں میں بھی بڑے پیمانے پر مالی نقصان ہوا۔ اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کوفی عنان نے ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو ایک اخباری کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''ایک دوسرا اور بڑے پیمانے پر المیہ رُونما ہوسکتا ہے، اگر ابھی سے ہم نے اپنی تمام تر توانائیاں بچ جانے والوں پر مرکوز نہ کیں۔''

اس وقت کے وزیراعظم اور وزیر داخلہ نے متاثرین سے سرد موسم کی آمد سے پہلے ہی پہاڑی علاقوں سے نیچے میدانی علاقوں میں منتقل ہونے کی اپیل کی، کیونکہ بڑے پیمانے پر ہونے والی تباہی کی وجہ سے مواصلات کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا اور بگڑتے موسم کی وجہ سے امدادی اداروں اور کارکنوں کو متاثرین تک پہنچنے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

مشکل کی اس گھڑی میں بیدار ضمیروں نے ان مصیبت زدوں کی دل کھول کر امداد کی۔ ملکی اور غیر ملکی میڈیا نے اس واقعہ کو نمایاں جگہ دی جس کے بعد ملک بھر کے فلاحی ادارے مدد کے لیے سرگرم ہو گئے، ملک کی تمام سیاسی اور مذہبی جماعتیں اس قومی سانحے پر متحد ہو کر امدادی کام

میں جُت گئی تھیں۔اس موقع پر ملک بھر کی عوام نے ہر طریقے سے اپنے متاثرہ بھائیوں کی مدد کی بھرپور کوششیں کیں، زلزلہ زدہ علاقوں میں لوگوں کو ٹینٹ، خوراک، گرم کپڑے، پینے کا صاف پانی اور دیگر ضروریات زندگی کو فی الفور پہنچانے کے لیے اقدام اٹھائے گئے۔ان کارروائیوں میں سب سے زیادہ حصہ پاکستان کی بہادر افواج کا تھا جنہوں نے ۲۴ گھنٹے کام کر کے اپنے متاثرہ بھائیوں کی مدد کی۔ایدھی فاؤنڈیشن نے آٹا، دالیں، پکانے کا تیل اور پینے کا صاف پانی فراہم کرنا شروع کیا۔بہت کم مُدت میں ہی ایدھی کے رضا کار متاثرہ علاقوں میں پھیل گئے تھے۔وہ اپنے ساتھ چھوٹی ہوا بھری کشتیاں بھی لائے تھے جن کی مدد سے زخمیوں اور کھانے پینے کی اشیاء کو دریاؤں کے پار پہنچانے میں بہت آسانی ہوئی۔

اسی طرح اطلاعات ملتے ہی غیر ملکی سطح پر بھی امدادی کام کا آغاز کر دیا گیا تھا۔اس وقت کی حکومت نے سنگین صورتِ حال دیکھتے ہوئے عالمی برادری سے فوری مدد کی اپیل کی تو عالمی برادری نے بھی اس موقع پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مالی امداد کے ساتھ بحالی میں بھی بھرپور مدد فراہم کی۔کشمیر میں پاکستان اور بھارت کے درمیان لائن آف کنٹرول کو پانچ مختلف جگہوں سے تاریخ میں پہلی بار کھول دیا گیا، تاکہ لوگوں کو بآسانی صحت اور انسانی ہمدردی کی بنیاد پر امداد پہنچائی جا سکے۔اسی تناظر میں دنیا بھر سے امدادی ادارے اور کارکن ابتدائی امداد پہنچانے یہاں پہنچے۔خادم الحرمین الشریفین شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز کی اپیل پر سعودی عوام نے ۳۵۰ ملین سعودی ریال کے علاوہ دو ہزار ٹن روزمرہ استعمال کی اشیاء

پاکستان کے زلزلہ متاثرین کے لیے بھجوائی۔ کینیڈا، امریکا، اور برطانیہ سے پاکستانی ڈاکٹر ضروری سامان کے ساتھ پہنچے اور فیلڈ ہسپتال قائم کر کے زخمیوں کے علاج اور آپریشن شروع کر دیے۔ جب کہ مڈلینڈ ڈاکٹرز ایسوسی ایشن برطانیہ کی جانب سے بالاکوٹ میں ایک بہت بڑا ہسپتال قائم کیا گیا۔ اسی طرح کیوبا، ترکی اور متحدہ عرب امارات سے بھی بڑی تعداد میں رضا کاروں نے متاثرہ علاقوں میں امدادی سرگرمیاں شروع کیں۔ اس وقت کی حکومت نے ایک ریلیف فنڈ بھی قائم کیا جس میں لاکھوں لوگوں نے عطیات دیئے۔ زلزلہ زدگان کی امداد کے سلسلے میں بیرون ممالک بھی پیچھے نہیں رہے۔ ۱۱ نومبر ۲۰۰۵ء کو وفاقی حکومت اور عالمی اداروں کی جانب سے جاری کی گئی رپورٹ میں بتایا گیا کہ اس سلسلے

میں ۵ ارب ڈالر کا نقصان ہوا، ۵۷ لاکھ افراد متاثر ہوئے، جن کی تعمیرِ نو پر ۵ء۱۳ ارب ڈالر اور ریلیف آپریشن کے لئے ۵ء۱۱ ارب ڈالر درکار ہیں۔

الغرض مصیبت و آفت کی اس گھڑی میں عوام نے پاک فوج کے ساتھ مل کر امدادی کارروائیوں میں بھرپور حصّہ لیا۔ مُلک بھر میں امدادی کیمپ لگائے گئے، ماؤں نے اپنی بیٹیوں کے جہیز کے نئے بستر تک نکال کر اپنی قوم کے مجبور بہن، بھائیوں کو پیش کر دیئے۔ اس کے علاوہ عالمی ڈونر کانفرنس طلب کی گئی، جس میں تمام ممالک کے مندوبین نے شرکت کی اور متاثرینِ زلزلہ کے لیے اربوں ڈالرز کی امداد دی، لیکن افسوس کہ مناسب منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے امداد کا درست استعمال نہیں ہوسکا اور وہ اصل متاثرین تک نہ پہنچ سکی، بالخصوص بالاکوٹ اور کشمیر میں تاحال تعمیر و ترقی میں کسی قسم کی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے کو سترہ سال بیت چکے ہیں مگر متاثرہ لوگوں کی آہوں اور

سسکیوں کی بازگشت آج بھی سماعتوں سے ٹکرا کر ماحول کو افسردہ بنا دیتی ہے۔ حکومت زلزلے میں جاں بحق ہونے والوں کے لواحقین کو ایک، ایک لاکھ روپے اور گھر تباہ ہونے والے خاندانوں کو فی کس ایک لاکھ، ۷۵ ہزار روپے تھما کر ایک طرف ہوگئی۔ لوگوں نے اپنی مدد آپ ہی کے تحت جیسے تیسے کچے پکے گھر تو تعمیر کر لیے، مگر کسی بھی دَورِ حکومت میں ان کی مستقل رہائش گاہوں کے بارے میں کچھ نہیں سوچا گیا۔

عالمی اداروں کی رپورٹ کے بعد بالاکوٹ کی دو یونین کاؤنسلز، گرلاٹ اور بالاکوٹ کو فالٹ لائن پر ہونے کے سبب ''ریڈ زون'' قرار دیا گیا تھا، لہٰذا ۲۰۰۶ء میں پختہ تعمیرات پر پابندی عائد کرتے ہوئے وہاں مقیم ۵۴۰۰ خاندانوں کو بکریال کے مقام پر ''نیو بالاکوٹ سٹی'' کے نام سے

شہر تعمیر کر کے وہاں بسانے کا فیصلہ کیا، مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ اکتوبر ۲۰۰۶ء میں پریذیڈنٹ ریلیف فنڈ سے نئے شہر کے لیے صوبائی حکومت کو ڈیڑھ ارب روپے دیے گئے، جس سے ۴۳۶، ۱۱ کنال، ۱۹ مرلے زمین خریدی گئی مگر بعد ازاں، کام سیاست کی نذر ہوگیا۔ متاثرین کو نیو بکریال سٹی میں ۲۰۱۱ء میں منتقل ہونا تھا، مگر اب تک وہاں جانے والی سڑک تک نہ بن سکی، جب کہ منصوبہ مکمل طور پر بند ہو چُکا ہے۔ ارباب اختیار کی طرف سے اس کی بحالی کے لیے کوئی سنجیدہ اقدام نہیں اُٹھائے گئے۔ زلزلے سے لے کر اب تک کشمیر میں سات مختلف وزیراعظم برسرِ اقتدار رہے تاہم متاثرین کے لیے کسی کی بھی طرف سے کوئی خاطر خواہ اقدام نہیں اٹھائے گئے۔ یہاں تک کہ فراہمی و نکاسیٔ آب کا کوئی مناسب نظام بھی ابھی تک نہیں بنایا جا سکا۔

بنیادی ضروریات میں تعلیم بھی انسان کا ضروری حق ہے لیکن اس سانحہ نے تعلیم کا حق بھی ان بچوں سے چھین لیا۔ایک اندازے کے مطابق اس زلزلے کے نتیجے میں مانسہرہ کے ۱۶۱۴ اسکولز تباہ ہوئے، جو ہنوز مکمل طور پر تعمیر نہیں ہو سکے۔ اگر کہیں تعلیمی اداروں کی اَز سرِ نو تعمیر ہو بھی رہی ہے، تو کام انتہائی سُست رَوی کا شکار ہے، جس کے باعث بیش تر طلبہ اب بھی خیموں یا پھر آسمان تلے تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں۔ خیبر پختونخواہ میں پچھلے آٹھ سال سے تعلیمی ایمرجنسی کی دعوے دار حکومت نے بھی اس پر کوئی توجّہ نہیں دی۔ درجنوں اسکولز کی عمارات تو تعمیر ہونا دُور کی بات، اُن کا سروے تک نہیں کیا گیا۔ جن اسکولز کو فنڈز ملے وہ ٹھیکے دار لے اُڑے۔ ایرا کی طرف سے جاری تازہ اعداد و شمار کے مطابق اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے سے تباہ ہونے والے شعبہ تعلیم کے ۲۸۱۹، ماحولیات کے ۲۱۷، گورننس کے ۲۱۴، محکمہ صحت کے ۱۱۳، توانائی کے ۵، سماجی تحفظ کے ۱۳ جبکہ ٹرانسپورٹ کے ۵۷ منصوبے تا حال تکمیل کے مراحل میں ہیں۔

ادویات اور اسپتالوں کی بات کی جائے تو چند صحت کے مراکز کے علاوہ کہیں بھی کوئی تربیت یافتہ طبی عملہ مثلاً ڈاکٹر، نرسیں اور دائیاں موجود نہیں ہیں اور نہ ہی کسی ہنگامی حالت سے نمٹنے کے لیے کوئی سہولیات دستیاب تھیں۔ سترہ برس بعد بھی متاثرین حکومتی وعدوں کی تکمیل کے منتظر ہیں۔ ہر سال سانحے کی برسی پر فوٹو سیشنز تو ہوتے ہیں مگر کوئی ایک وعدہ بھی وفا نہ ہوا۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا ملک ارضیاتی اعتبار سے نہایت حساس خطے میں واقع ہے، چنانچہ ان خطرات کا ادراک کرتے ہوئے ہمیں حفاظتی اقدامات کی ہمہ وقت ضرورت ہے۔ زلزلوں کے حوالے سے حساس مقامات کے لیے تعمیرات کے مخصوص قواعد و ضوابط ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کا بڑا حصہ اس ارضیاتی دائرے میں آتا ہے جہاں شدید زلزلوں کے خطرات درپیش ہیں مگر ہم زلزلوں کے لیے خصوصی بلڈنگ کوڈ کا کتنا خیال رکھتے ہیں یہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ بلڈنگ کوڈ پر عمل کرنے سے زلزلوں کے نقصانات کو کم کیا جا سکتا ہے اس جانب بھی حکومت کو خصوصی توجہ دینا ہوگی۔ زندہ قومیں حادثات اور ناخوشگوار واقعات سے سبق حاصل کر کے مستقبل کی پیش بندی کرتی ہیں۔ بعد از آفات کے بجائے قبل از آفات کی حکمت عملی پر توانائی صرف کرنا ہی دانشمندی ہے۔

پولیو

محمد نواز طاہر

کسی بھی قوم کے لئے صحت مند نسل ناگزیر ہے اور اس ضمن میں اقدامات اُٹھانا ہر ریاست کی اوّلین ذمہ داری ہے، معمارانِ پاکستان کو تندرست و توانا رکھنے کے لئے ریاستِ پاکستان بھی اپنی ذمہ داریاں دستیاب وسائل میں ادا کر رہی ہے اور اگلی نسل کو پولیو جیسے مہلک مرض سے بچانے کے لئے قومی اور بین الاقوامی وسائل استعمال کر رہی ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان تمام اقدامات اور کوششوں کے باوجود پاکستان میں پولیو کا خاتمہ تاحال ممکن نہیں ہوسکا۔

پولیو صرف پاکستان نہیں ایک وقت میں پوری دنیا کا مسئلہ تھا جسے عالمی برادری نے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور ہنگامی اقدامات سے اس کا کا خاتمہ کر دیا۔ اب یہ صرف پاکستان اور ہمسائے برادر اسلامی ملک افغانستان میں باقی رہ گیا ہے جن میں خاتمے کی کوششیں جاری ہیں لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ ان تمام کوششوں کے باوجود اس کا خاتمہ کیوں نہیں ہو رہا۔ جب کھلے دل سے جائزہ لیا جاتا ہے تو اس میں انسانی غفلت سب سے بڑے عنصر کے طور پر سامنے آتی ہے اور جب غفلت کے اس عنصر پر مزید غور کیا جاتا ہے تو اس میں اس مہلک بیماری کے بارے میں شعور و ادراک کی کمی اور ایک خاص حد تک گمراہی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ ان پہلوؤں پر پاکستان میں ریاستی اور سماجی سطح پر غور کیا جاتا رہا ہے، کیا جا رہا ہے اور اس کو سامنے رکھ کر اقدامات اُٹھائے جا رہے ہیں جن میں سب سے اہم قدم اس کے بارے میں شعور اُجاگر کرنا ہے اور اس مہلک مرض سے بچاؤ کے اقدامات پر سختی سے عمل درآمد کرنا ہے۔ اس ضمن میں حکومتی سطح پر ذرائع ابلاغ کے ذریعے مہم چلائی جاتی ہے جس کے اب تک خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں لیکن سو فیصد نتائج حاصل ہونا باقی ہے۔

سب سے پہلے تو اس مرض کے اسباب یاد دلانا ضروری ہیں کہ یہ لاحق ہوتا کیوں ہے؟ اس ضمن میں بین الاقوامی طور پر مسلمہ رائے یہی ہے کہ اس کی بنیادی وجہ اور سبب انسانی خوراک کی نالی کے ذریعے جسم میں داخل ہونے والا وائرس ہے جو انسانی فضلے اور منہ کے راستے سے پھیلتا ہے، انسانی جسم میں داخل ہو کر انتڑیوں میں پھلنا پھولنا شروع کر دیتا ہے اور جب متاثرہ افراد اسے اپنے جسم سے خارج کرتے ہیں تو یہ مزید پھیلاؤ کا موجب بننے کا خطرہ بنا رہتا ہے جبکہ اس کے پھیلاؤ کے لئے سب سے زیادہ سازگار ماحول صفائی نہ ہونے والا یا، کم صفائی والا مقام ہوتا ہے، اس کے علاوہ مسلسل سفر، روزگار یا کسی وجہ سے نقل مکانی کرنے والے اور خانہ بدوشوں میں پھیلنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ یہ وائرس آنت

میں بڑھتا ہے جس کی ابتدائی علامات بخار، تھکاوٹ، سر درد، قے، گردن کی اکڑن اور اعضاء میں درد کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اس متعدی بیماری کا وائرس اعصابی نظام پر حملہ کرتا ہے اور چند گھنٹوں میں مکمل فالج کا سبب بن سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس سے بچاؤ کی تدابیر اور اقدامات کے سوا تا حال اس کا کوئی علاج بھی نہیں۔ یہ وائرس اگرچہ کسی بھی عمر کے انسان کو متاثر کر سکتا ہے لیکن پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کو نہ صرف مفلوج کر سکتا ہے بلکہ ان کی موت کا بھی باعث بن سکتا ہے۔ پولیو کا کوئی علاج نہیں، صرف اس سے بچا جا سکتا ہے۔ بچاؤ کے لئے بچوں کو حفاظتی ویکسین دی جاتی ہے جس کے بارے میں عالمی طبی ماہرین کی رائے ہے کہ یہ بچے کو زندگی بھر کی حفاظت کر سکتی ہے۔

پولیو ویکسین کی دو قسمیں ہیں ایک کو او پی وی او دوسری کو آئی پی وی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے منہ کے ذریعے دی جانے والی ویکسین کو او پی

وی کہتے ہیں جو محفوظ و مؤثر ہے جبکہ یہ ویکسین پلانے کے لئے کسی صحت کے ماہر یا جراثیم سے پاک سرنج اور سوئی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، اسے کئی بار دیا جا سکتا ہے اور یہ پولیو وائرس کے خلاف لمبے عرصے تک تحفظ فراہم کرتی ہے۔ دوسری قسم آئی پی وی ہے جو دینے کے لئے تربیت یافتہ طبی عملے، جراثیم سے پاک سرنج اور سوئی اور مناسب آلات و طریقہ کار کی ضرورت ہوتی ہے، یہ بچوں کو پولیو سے بچانے کے لئے انتہائی مؤثر قرار دی جاتی ہے تاہم اس کی صلاحیت او پی وی کے مقابلے میں محدود قرار دی جاتی ہے یوں او پی وی اور آئی پی وی کے مرکب سے پولیو وائرس کے خلاف تحفظ میں نسبتاً اضافہ ہوتا ہے۔ آئی پی وی خون میں شامل ہو کر قوتِ مدافعت میں اضافہ کرتی ہے جبکہ او پی وی آنتوں میں قوت

مدافعت بڑھاتی ہے۔ چنانچہ پاکستان میں بچوں کو معمول کی ویکسینیشن کے دوران او پی وی کی کئی خوراکوں کے علاوہ عام طور پر آئی پی وی کی تین خوراکیں تجویز کی جاتی ہیں۔

یہ وہ ویکسین ہے جس کے قطرے پلانے کے لئے حکومت مہم چلاتی ہے تاہم اسے کچھ مغالطوں کے باعث مزاحمت کا سامنا ہے، ایک مغالطہ مذہبی بنیاد پر ہے اور اس کا شدید ترین پراپیگنڈہ بھی کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے قطرے پلانے والے رضا کاروں کو بعض علاقوں میں شدید ترین مشکلات بھی پیش آتی ہیں۔ مزاحمت کاروں نے مختلف واقعات میں انسانی خدمت کا یہ کام کرنے والے رضا کاروں کی جانیں تک لے لی ہیں۔ ان مزاحمت کاروں کا ایک مغالطہ یہ ہے کہ ویکسین حرام ہے، انہیں اس ویکسین کے اجزا پر تحفظات ہیں حالانکہ منہ کے ذریعے دی جانے

والی ویکسین (او پی وی) کو دنیا بھر کے اسلامی قائدین حلال قرار دے چکے ہیں۔مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے ان قائدین میں جامعہ الازہر کے شیخ الاعظم طنطاوی، سعودی عرب کے مفتی اعظم اور مجالس کونسل آف علما انڈونیشیا کے جید علماء کرام شامل ہیں۔او پی وی کو محفوظ اور حلال قرار دینے والے دیگر اہم بین الاقوامی اسلامی اداروں میں دارالعلوم دیوبند، آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس، انٹرنیشنل یونین فار مسلم سکالرز (مفتی ڈاکٹر یوسف القرضاوی)، امام مسجد الاقصیٰ (بیت المقدس) اور کئی دیگر جید علمائے کرام، مفتیانِ کرام شامل ہیں۔علاوہ ازیں اہم بات یہ بھی ہے کہ سعودی عرب کی حکومت نے پولیو کے شکار ممالک سے تعلق رکھنے والے ہر عمر کے افراد پر پولیو ویکسین پینا لازم قرار دے رکھا ہے اور

کوئی شخص حج یا عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لئے (یا دیگر وجہ سے) پولیو ویکسین کے قطرے استعمال کرنے کا سرٹیفکیٹ پیش کیے بغیر سعودی عرب میں داخل نہیں ہوسکتا۔ان اقدامات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ پولیو کے قطروں کے بارے میں جن تحفظات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ درست نہیں۔مزید براں مہلک بیماری کے وائرس سے بچاؤ کے لئے چلائی جانے والی سرکاری مہم میں علماء کرام، معاشرے کے اہلِ رائے افراد کو بھی اس کا حصہ اسی لئے بنایا جاتا ہے کہ تاکہ عوام الناس اور خاص طور پر مزاحمت کاروں کے تحفظات بھی دور ہوں اور عام آدمی اپنے بچوں کو قطرے پلانے میں کسی سستی کا مرتکب نہ ہو جبکہ یہ سستی اور غفلت اگلی نسل کے لئے خوفناک اور انتہائی تکلیف دہ ہوسکتی ہے۔

ابتدائی سطور میں ذکر کیا گیا تھا کہ انسدادِ پولیو مہم بار بار چلائے جانے کے وہ نتائج سو فیصد برآمد کیوں نہیں ہوتے جن کی توقع کی جاتی ہے

تو اس کے ایک سے زائد محرکات ہو سکتے ہیں جن میں ابھی بھی اوّلین پہلو اس ویکسین کے خلاف تحفظات کا پوری طرح دُور نہ ہونا اور ویکسین کے خلاف ایک مخصوص طبقے کا پراپیگنڈا ہے۔ دوسری وجہ سینی ٹیشن اور غذائی کمیابی و بے احتیاطی ہے اور تیسری اہم وجہ آگہی و شعور اور تشہیری مہمات ہیں۔ ان مہمات میں ایک بات خاص طور پر نوٹ کی گئی ہے کہ تشہیری مہم صرف سرکار کی طرف سے چلائی جاتی ہے یا پھر اس میں مختلف ذرائع سے فنڈز حاصل کرنے والی غیر سرکاری تنظیمیں سرگرم دکھائی دیتی ہیں جن میں زیادہ تر ایک ہی طرح کے لوگ بار بار نظر تو آتے ہیں لیکن وہ صرف سیمینارز اور واک، یا ریلیوں میں ملتے ہیں۔ وہ عوام سے کم رجوع کرتے ہیں جبکہ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق بھی اشرافیہ سے ہوتا ہے اور وہ اس

طبقے کی حد تک کارگر ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کی دُور دراز تک رسائی بھی ہوتی ہے لیکن بہت زیادہ مؤثر نہیں، جن علاقوں میں اس شعور کی ضرورت ہے وہاں پہنچنے میں وہ خود تحفظات اور خطرات محسوس کرتے ہیں۔ تشہیری مہم میں بھی فنڈز کا بڑا حصہ اقرباء پروری اور افراد کو نوازنے پر صرف ہو جاتا ہے۔ ایسے ایسے اخبارات پر فنڈز اشتہارات کی مد میں استعمال ہوتے ہیں جو عوام تک رسائی نہیں رکھتے، ان حالات میں صرف سرکاری میڈیا کے ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن اپنا کردار ادا کرتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ پولیو کے خلاف مہم کو محکمہ صحت ہی کی ذمہ داری تصور کیا جاتا ہے، دیگر محکمے اس کی آگہی مہم کو اپنی قومی مہم کے طور پر نہیں چلاتے۔ ایسی تفصیلی بحث یا ذمہ داری کا تعین نہیں کیا جاتا ہے کہ ہر وقت عوام کی توجہ کے مرکز عوامی نمائندے اپنے حلقے میں ہر بچے کو پولیو کے قطرے پینے کے عمل کو یقینی بنانے کی ذمہ داری لیں جبکہ یہ

قومی مسئلہ ہے اور اسے قومی مسئلے کے طور پر ڈیل کیا جانا چاہیے۔ ہر ادارے کے کردار کا تعین کر کے اس پر عملدرآمد کرانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ انتخابی عمل میں امیدوار بننے والوں کے اپنے اور تائید و تجویز کنندگان پر اپنے بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے کا سرٹیفکیٹ پیش کرنا لازم قرار دیا جائے جبکہ پولیو کے قطروں کا ریکارڈ روزانہ کی بنیاد پر نادرا میں اَپ ڈیٹ کیا جائے اور ویکسینیشن پوری ہونے پر کورونا طرز کا سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے، اسی طرح سفر کے لئے کورونا سرٹیفکیٹ کی طرح ریلوے میں بھی ٹکٹ کے اجرأ کے وقت اُسے پیش کرنا لازم قرار دینے سے یہ مہم کامیاب کی جاسکتی ہے۔ ویکسین کے حرام ہونے کے تحفظات دُور کرنے کے لئے جس طرح مسلم قائدین

نے فتوے اور آراء دی ہیں وہ عوام تک مؤثر انداز سے پھیلائے جائیں اور تمام دینی درسگاہوں تک پہنچائے جائیں اور خطیب حضرات کو پابند بنایا جائے کہ وہ ان فتوؤں کو اپنی تقریر کا حصہ بنائیں اور خاص طور پر صوبہ خیبر پختونخواہ کے ان علاقوں میں فوکس کیا جائے جہاں ابھی تحفظات پوری طرح سے دُور نہیں ہوئے اور ویکسین کے خلاف مزاحمت بھی دکھائی دیتی ہیں۔ تمام تعلیمی اداروں کو بھی کردار سونپا جائے۔

اس وقت کی صورتِ حال پولیو وائرس کے بین الاقوامی پھیلاؤ پر انٹرنیشنل ہیلتھ ریگولیشنز (۲۰۰۵ء) (آئی ایچ آر) کے تحت ہنگامی کمیٹی کے ۱۵ جون ۲۰۲۲ء کو منعقد ہونے والے بتیسویں اجلاس سے واضح ہوتی ہے جس میں عالمی ادارہ صحت کے ڈائریکٹر جنرل اور متعلقہ مشیروں نے بھی شرکت کی اور کمیٹی نے صوبہ خیبر پختونخواہ (کے پی) کے ضلع شمالی وزیرستان میں وائرس پھیلنے پر تشویش کا اظہار کیا۔ کمیٹی کو بتایا گیا کہ جنوبی

کے پی میں پیشرفت میں رکاوٹ کا باعث پیچیدہ سیکورٹی صورتِ حال نیز ویکسینیشن سے اِنکار کے ساتھ کمیونٹی کی مزاحمت جیسے چیلنجز شامل ہیں۔ کمیٹی نے اس بات کو بھی خاص طور پر نوٹ کیا کہ پاکستان میں زیادہ خطرے والی موبائل آبادی جیسے تارکین وطن، خانہ بدوش، بے گھر آبادی، خاص طور پر افغان مہاجرین بین الاقوامی پھیلاؤ کے مخصوص خطرے کو ظاہر کرتی ہے۔ کمیٹی نے بھی یہی مؤقف دوہرایا ہے کہ سفر میں رہنے والوں پر ایک مہینے کے بعد ویکسین کا سرٹیفکیٹ لازم قرار دیا جائے۔ کمیٹی نے زور دیا کہ پولیو مہم کو جہاں بھی ممکن ہو صحت عامہ کے دیگر اقدامات کے ساتھ مربوط کیا جائے۔ اس کمیٹی نے بھی مشورہ دیا ہے کہ پولیو کی مہم کو گھر گھر پھیلایا جائے اور یوں اسے ٹاک آف ٹاؤن سے لے

کر ٹاک آف ہوم میں تبدیل کیا جائے۔

اس میں دو رائے نہیں کہ ملک میں چلائی جانے والی پولیو مہم کے عام آدمی پر اثرات مرتب ہوئے ہیں اور عام آدمی کو پولیو کے بارے میں شعور آیا ہے اور وہ بچوں کو پولیو ویکسین پلانے میں دلچسپی رکھتا ہے لیکن اصل مسئلہ ان علاقوں کا ہے جہاں اس ویکسین کو دُرست نہیں سمجھا جاتا اور اسے دُرست تسلیم کرانا ہی کامیابی ہے جو صحت مند توانا، تندرست محفوظ نسل اور محفوظ پاکستان کی ضمانت ہے۔

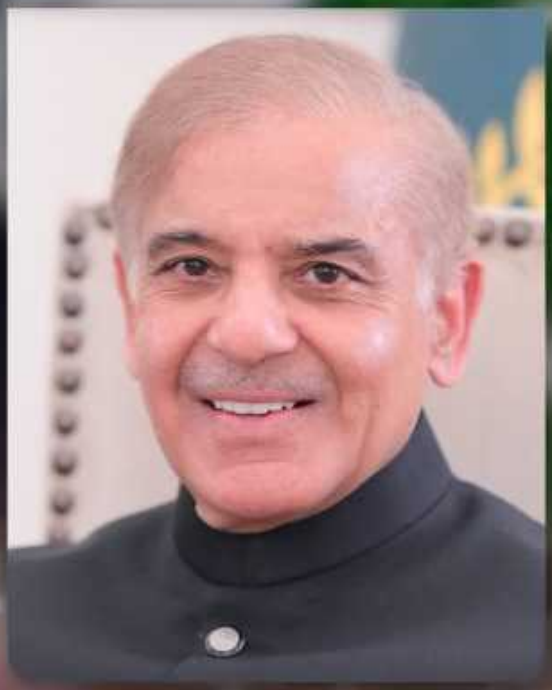

وزیراعظم کا قطر کا کامیاب دورہ

ظہیر احمد

پاکستان اس وقت جس معاشی دباؤ سے گزر رہا ہے اس کے اسباب کثیر الجہتی ہیں۔ آئی ایم ایف اور ایف اے ٹی ایف کی کڑی شرائط کو پورا کرنے کے لئے حکومت پاکستان کو کئی مشکل فیصلے لینے پڑے ہیں۔ عوام اتحادی حکومت سے بالعموم اور وزیراعظم شہباز شریف سے بالخصوص ارفع توقعات باندھے بیٹھے ہیں۔ اس صورتِ حال میں وزیراعظم شہباز شریف نے اگست کے آخری ہفتے دوست اور برادر اسلامی ملک قطر کا کامیاب دورہ کیا۔ اس دورے کی دعوت امیر قطر نے خصوصی طور پر خود دی تھی کیونکہ قطر کو پاکستان کے موجودہ حالات کا علم ہے۔ اسے اندازہ ہے کہ اس وقت پاکستان کو سرمایہ کاری کی ضرورت ہے چنانچہ انہوں نے وزیراعظم کو دعوت دی کہ وہ قطر آ کر یہاں کے سرمایہ کاروں کو پاکستان میں سرمایہ کاری پر راغب کریں۔ وزیراعظم کا یہ دورہ دو دن کا تھا جس کے دوران ان کی مصروفیات کا شیڈول انتھک رہا اور انہوں نے اپنے ان دو روز کے دوران کوئی ایک لمحہ بھی فرصت کا نہیں گزارا بلکہ ایک ایک لمحہ اپنی قوم کے لئے وقف کر رکھا، وزیراعظم کی محنت رنگ لائی اور وہ کئی

ثمرات سمیٹنے میں کامیاب رہے۔ وزیراعظم شہباز شریف نے امیر قطر شیخ تمیم بن حمد الثانی سے ملاقات کی اور انہیں پاکستان میں سرمایہ کاری کے لئے قائل کیا۔

امیر قطر نے وزیراعظم کو عہدہ سنبھالنے پر مبارکباد دی اور ان کی مکمل کامیابی کی خواہش کی اور پاکستان کے ساتھ مضبوط اقتصادی شراکت داری قائم کرنے کے عزم کا اعادہ کیا۔ وزیراعظم نے امیر قطر کو جلد از جلد پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ ایک ٹوئٹ میں وزیراعظم محمد شہباز شریف نے کہا کہ پاکستان نے قطر کے ساتھ اپنے بہترین دوطرفہ تعلقات کو اسٹریٹجک مصروفیات کی اگلی سطح تک لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔

وزیراعظم نے کہا کہ پاکستان قطر کے ساتھ اپنے دیرینہ اور دوستانہ تعلقات کو اہمیت دیتا ہے جو کہ باہمی اعتماد اور مستقل حمایت کی مضبوط بنیادوں پر مبنی ہیں۔ وزیراعظم نے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کو بلند کرنے میں شیخ حمد بن خلیفہ الثانی کی طرف سے ادا کیے گئے کردار کو سراہا اور ان کے دور میں پروان چڑھنے والے مضبوط تعلقات کو تسلیم کیا۔

کسی ملک کی معیشت میں بیرونی سرمایہ کاری آکسیجن کا درجہ رکھتی ہے۔ دونوں رہنماؤں نے پاکستان اور قطر کے درمیان تعاون کو فروغ دینے پر اتفاق کیا۔ امیر قطر شیخ تمیم بن حمد الثانی سے وزیراعظم کی ملاقات میں وزیراعظم کے ہمراہ کابینہ کے وزراء اور سینئر ارکان سمیت اعلیٰ سطح کا وفد شامل تھا۔ پاک آرمی کے چیف جنرل قمر جاوید باجوہ بھی وفد میں موجود تھے۔ وزیراعظم محمد شہباز شریف اور امیر قطر شیخ تمیم بن حمد الثانی نے ملاقات کے دوران دوطرفہ اور باہمی دلچسپی کے اُمور پر بھی تبادلہ خیال کیا۔ وزیراعظم شہباز شریف کے اس دورے کو قطر نے بڑی اہمیت دی۔ وہ قطر کے امیر سے ملاقات کے لئے دیوان امیری پہنچے تو ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ ریڈ کارپٹ بچھایا گیا جہاں ان کے اعزاز میں باضابطہ

تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ وزیراعظم محمد شہباز شریف نے امیر قطر کے والد شیخ حمد بن خلیفہ الثانی اور والدہ موزہ بنت نصر سے بھی ملاقات کی اور دونوں برادر ممالک کے درمیان تعلقات کو مضبوط بنانے کے لئے ان کے کردار کو سراہا۔ سمندر پار پاکستانی بھی ملکی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی طرف سے پاکستان بھجوائے جانے والی ترسیلات زر سے ملکی زرمبادلہ کے ذخائر میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ وزیراعظم نے قطر اور پاکستان کی ترقی میں کردار ادا کرنے والے قطر میں مقیم ۲ لاکھ سے زیادہ پاکستانیوں کی میزبانی پر بھی امیر قطر کے والد کا شکریہ ادا کیا اور قطر کے وژن ۲۰۳۰ء کے حوالے سے پاکستان کے تعاون کا یقین دلایا۔ انہوں نے امیر قطر کے والد اور والدہ کو دورہ پاکستان کی

دعوت دیتے ہوئے رواں سال ہونے والے فیفا ورلڈ کپ ۲۰۲۲ء کی میزبانی پر قطر کے لئے خیر سگالی کے جذبات اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ وزیراعظم نے قطری تاجروں کو پاکستان کے توانائی، ہوابازی، زراعت اور لائیو سٹاک، میری ٹائم، سیاحت اور مہمان نوازی کے شعبوں میں سرمایہ کاری کی دعوت دی۔ وزیراعظم شہباز شریف کے دورہ قطر کے موقع پر قطری حکام نے ایئرپورٹ اور ہوٹل کے شعبے میں سرمایہ کاری کی خواہش ظاہر کر دی۔ ذرائع کے مطابق قطر کی جانب سے ہوابازی کے شعبے میں بڑی سرمایہ کاری کا امکان ظاہر کیا گیا ہے۔ امکان ہے کہ اسلام آباد ایئرپورٹ کے انتظامی اُمور قطر کے حوالے کئے جائیں گے۔ ذرائع کے مطابق ایئرپورٹ ٹرمینل اور کارگو خدمات قطر پولنگ کمپنی مہیا کرے گی جبکہ پی آئی اے کے نیویارک میں روز ویلٹ ہوٹل میں بھی سرمایہ کاری کے عوض حصص قطر کو دیئے جائیں گے۔ ایوی ایشن شعبوں میں سرمایہ کاری گورنمنٹ ٹو گورنمنٹ سطح پر معاہدوں کے ذریعے کی جائے گی۔ وزیراعظم محمد شہباز شریف اور امیر قطر شیخ تمیم بن حمد الثانی نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ دونوں ممالک کے درمیان مختلف شعبوں میں تعاون کے فروغ کے نئے مواقع پیدا کئے جائیں۔ وزیراعظم شہباز شریف

کے دورہ قطر کی ایک بڑی کامیابی فیفا فٹبال ورلڈ کپ میں میزبان قطر کو سیکورٹی معلات میں تعاون فراہم کرنا ہے۔اس اہم ترین عالمی ایونٹ پر پوری دنیا کی نظریں ہوتی ہیں۔ وزیراعظم شہباز شریف نے قطر کے شہر دوحہ میں فیفا ورلڈ کپ سٹیڈیم کا دورہ کیا اور فٹبال ورلڈ کپ ۲۰۲۲ء کی میزبانی کے لئے تیاریوں کا جائزہ لیا۔حکام کی جانب سے وزیراعظم شہباز شریف کو فیفا ورلڈ کپ ۲۰۲۲ء کی میزبانی کے لئے تیاریوں پر بریفنگ دی گئی۔فٹبال ورلڈ کپ میں سکیورٹی خدمات انجام دینے کے لئے قطر نے پاکستان سے معاہدہ کیا ہے۔معاہدے کے تحت فٹبال ورلڈ کپ کی سکیورٹی کے لئے پاکستان اپنے فوجی اہلکار قطر بھیجے گا۔وزیراعظم محمد شہباز شریف نے کہا ہے کہ ہمیں فخر ہے کہ فیفا ورلڈ کپ ۲۰۲۲ء کا آفیشل میچ

بال الریحلہ پاکستان میں بنایا گیا ہے۔اپنے دورے کے دوران وزیراعظم محمد شہباز شریف نے قطر انوسٹمنٹ اتھارٹی (کیو آئی اے) کی پاکستان میں مختلف تجارتی اور سرمایہ کاری کے شعبوں میں ۳ بلین ڈالر کی سرمایہ کاری پر آمادگی پر امیر قطر کا شکریہ ادا کیا۔دونوں رہنماؤں نے وفود کی سطح پر مشاورت کی، جس کے بعد امیر کی طرف سے وزیراعظم اور ان کے وفد کے اعزاز میں ظہرانے کی ضیافت دی گئی۔اپنی وسیع مشاورت کے دوران دونوں رہنماؤں نے دوطرفہ، علاقائی اور بین الاقوامی اُمور پر تبادلہ خیال کیا۔انہوں نے پاکستان قطر دوطرفہ تعلقات پر اطمینان کا اظہار کیا اور باہمی دلچسپی کے تمام شعبوں میں دوطرفہ تعاون کو مزید مستحکم کرنے کے لیے مل کر کام کرنے پر اتفاق کیا۔دونوں فریقوں نے باہمی تجارت کو بڑھانے کے لیے ادارہ جاتی روابط کو مضبوط بنانے پر اتفاق کیا۔مزید برآں زراعت، خوراک، توانائی کے شعبوں میں تعاون بڑھانے اور پاکستان میں قابل تجدید توانائی، سیاحت اور ہوٹلنگ کے شعبوں میں قطر کی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی پر اتفاق کیا گیا۔قطر میں کام کرنے میں دلچسپی رکھنے والے پاکستانیوں کو مزید مواقع فراہم کرنے، دفاع، ایوی ایشن اور میری ٹائم ڈومینز میں تعاون کو وسعت دینے پر بھی بات چیت کی

گئی۔فریقین نے توانائی کے شعبے میں باہمی فائدہ مند تعاون کے لیے نئی راہیں تلاش کرنے پر بھی اتفاق کیا۔وزیراعظم اور امیر نے خطے میں ہونے والی پیش رفت پر بھی تبادلہ خیال کیا۔وزیراعظم نے افغانستان میں امن اور مفاہمت کے فروغ کے لیے قطر کی دیرینہ اور مسلسل کوششوں کو سراہا۔دونوں رہنماؤں نے افغان عوام کو درپیش سنگین انسانی اور معاشی بحرانوں سے نمٹنے میں مدد کے لیے مل کر کام کرنے پر اتفاق کیا۔کوئی پاکستانی حکمران بیرونی دورے پر جائے اور کشمیر کا اور کشمیریوں کی آزادی کی جدوجہد کا ذکر نہ کرے یہ ممکن ہی نہیں۔اس ملاقات میں وزیراعظم نے بھارت کے غیر قانونی طور پر مقبوضہ جموں وکشمیر (آئی آئی او جے کے) میں انسانی حقوق کی سنگین صورتِ حال کا ذکر کیا۔شہباز شریف نے

بھرپور وکالت کی اور واضح کیا کہ جنوبی ایشیا میں پائیدار امن، سلامتی اور خوشحالی کے لیے جموں وکشمیر کے تنازع کے پرامن حل کی اہمیت مسلمہ ہے۔سرمایہ کاری کے لئے نجی شعبے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔چنانچہ وزیراعظم محمد شہباز شریف نے قطر بزنس ایسوسی ایشن (کیو بی اے) کے وفد سے بھی ملاقات کی۔شہباز شریف اس ملاقات میں بڑے احسن طریقے سے پاکستان میں سرمایہ کے لئے قطر کے بزنس مینوں کو قائل کرتے رہے۔وفد کی قیادت کیو بی اے کے چیئرمین شیخ فیصل بن قاسم الثانی کررہے تھے۔اس ملاقات میں کابینہ کے اہم ارکان اور اعلیٰ حکام بھی موجود تھے۔وزیراعظم نے قطر کے نجی شعبے کو متحرک کرنے میں قطر بزنس ایسوسی ایشن کے کردار کو سراہا۔شیخ فیصل بن قاسم الثانی نے وزیراعظم کو آگاہ کیا کہ وہ تعاون کی راہیں تلاش کرنے کے لیے جلد ہی کیو بی اے کا ایک نمائندہ تکنیکی سطح کا وفد پاکستان بھیجیں گے۔انہوں نے ایسوسی ایشن کے سینئر ممبران کے ہمراہ وزیراعظم کی دورہ پاکستان کی دعوت بھی قبول کی۔

پاکستان میں سیلاب نے تباہی مچادی..... بڑے پیمانے پر امدادی سرگرمیاں

محمد تنویر ہاشمی

تاوقتِ تحریر بارشوں اور سیلاب نے رواں برس پاکستان کے بڑے رقبے اور ۱۲ فیصد سے زائد آبادی میں تباہی مچادی۔ درجنوں دیہات صفحۂ ہستی سے مٹ گئے، ساڑھے تین کروڑ لوگ سیلاب سے متاثر ہوئے جن میں ۴۵۳ بچوں سمیت ۱۲۹۰ سے زائد افراد جاں بحق ۱۲ ہزار سے زائد زخمی ہوگئے۔ ۸ لاکھ کے قریب مویشی مرگئے، ۱۴ لاکھ ۶۸ ہزار ۱۹ گھر تباہ ہوگئے ہیں۔ لاکھوں ایکڑ رقبے پر فصلیں، سبزیاں اور پھل تباہ ہوگئے۔ چاروں صوبوں میں سیلاب سے متاثرہ اضلاع میں امدادی کارروائیوں کے لیے پاک فوج کو طلب کیا گیا۔ عالمی برادری کی جانب سے ہنگامی امداد، خیمے، اشیائے خورد و نوش فراہم کیے جارہے ہیں تاہم متاثرین کی بحالی کے لئے حکومت نے آئی ایم ایف، عالمی بنک، ایشیائی

ترقیاتی بنک اور دیگر مالیاتی اداروں سے بھی امداد لینے کا فیصلہ کیا ہے۔

۱۰ارب ڈالر سے زائد کا نقصان ہو چکا ہے، حکومت، پاک فوج، نجی جماعتوں اور این جی اوز کے علاوہ بیرون ملک سے امداد کے ذریعے بڑے پیمانے پر امدادی سرگرمیاں شروع کی گئی ہیں لیکن تباہی اس قدر زیادہ اور دُور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی ہے کہ ہر شخص تک امداد پہنچنا مشکل ہو گیا ہے، سندھ کے زیریں اور نشیبی علاقوں میں دُور دُور تک سیلابی پانی ہے۔ اکثر دیہات ڈوبے ہوئے ہیں۔ سیلاب کے دوران وبائی امراض، بیماریاں اور صحت کے مسائل نے جنم لے لیا ہے۔ پانی سے بیماریاں پھیلنے کا خدشہ ہے۔ ابتدائی امدادی سرگرمیاں، خوراک، ادویات اور خیموں

کی فراہمی جاری ہے تاہم اس کے بعد تعمیرِ نو اور بحالی کا عمل نہایت مشکل ہوگا جس میں کئی برس کا عرصہ لگ سکتا ہے۔ اس سال مون سون کی غیر متوقع اور شدید بارشوں سے آنے والے سیلاب نے پاکستان کے ایک بڑے رقبے کو اپنی لپیٹ میں لیا جن میں بلوچستان اور سندھ، جنوبی پنجاب، خیبر پختونخواہ کا بڑا علاقہ اور گلگت بلتستان سیلاب کی زد میں آ گئے۔ ملک کے ۸۰ اضلاع سیلاب سے بُری طرح متاثر ہوئے۔ انفراسٹرکچر تباہ ہو گیا۔ ملک کا ریلوے اور ٹرانسپورٹ کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ متعدد رابطہ پل ٹوٹ گئے۔ شاہراہیں بہہ گئیں اور اکثر شہروں اور دیہات کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے اور ریلیف کیمپوں میں منتقل کیے گئے۔ ویسے تو پاکستان جس خطے میں واقع ہے یہ مون سون کا خطہ ہے اور اس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ سیلابوں اور خشک سالی کا خطہ ہے یعنی کسی سال بہت زیادہ مون سون بارشوں سے سیلاب

آتے ہیں تو کسی سال بارشیں بہت کم ہوتی ہیں جس سے خشک سالی حتیٰ کہ قحط کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے لیکن حالیہ عرصے میں ماحولیاتی تبدیلیوں نے موسمی حالات یکسر بدل دیئے ہیں جو زیادہ سنگین اور غیر متوقع ہو گئے ہیں، معاشی بدحالی کے پہلے سے شکار پاکستان میں تباہ کن سیلاب نے معیشت کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی اور معاشی بوجھ مزید بڑھ گیا ہے، مہنگائی جو تاریخ کی بلند ترین سطح کو چھو رہی ہے اس میں مزید اضافہ ہوگا۔ اجناس، سبزیوں، پھلوں اور لاکھوں مویشی مرنے کے باعث گوشت کی بڑے پیمانے پر قلت ہو جائے گی۔ زرعی شرح نمو جس کا ہدف ۳٫۵ فیصد مقرر کیا گیا تھا اب یہ گروتھ منفی میں چلی جائے گی جس سے مجموعی اقتصادی شرح نمو متوقع ۵ فیصد

سے کم ہو کر ۲ سے ۳ فیصد پر آجائے گی اور ملک میں غربت اور بے روزگاری میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ جو اضلاع سب سے زیادہ متاثر ہوئے ان میں بلوچستان کے ۳۱، سندھ کے ۲۳، پنجاب کے ۳، خیبر پختونخواہ کے ۱۷ اضلاع اور گلگت بلتستان کے ۶ اضلاع شامل ہیں۔ وزیراعظم شہباز شریف کی زیر صدارت اجلاس میں ہونے والے فیصلے کے مطابق وفاقی وصوبائی حکومتوں اور مسلح افواج کے نمائندوں پر مشتمل نیشنل فلڈ ریسپانس کوآرڈینیشن سینٹر (این ایف آر سی سی) قائم کر دیا گیا ہے اس کے قیام کا مقصد ریسکیو، ریلیف اور بحالی اور تعمیراتی سرگرمیوں کے دوران امدادی کوششوں کو بہتر انداز میں مربوط اور ہم آہنگ بنانا ہے۔ این ایف آر سی سی کے قیام سے ملکی و غیر ملکی امدادی کوششوں کو ہم آہنگ کرتے ہوئے سیلاب کی موجودہ صورتحال کے ردِعمل کے مختلف پہلوؤں کے جائزہ، منصوبہ بندی، عمل درآمد اور مربوط کرنے میں مدد ملے گی۔ اس کے

علاوہ این ایف آر سی سی مستقبل میں آنے والی ایسی آفات سے نمٹنے کے لئے قومی نظام، بنیادی ڈھانچے کے لئے درکار ردِعمل کے حوالے سے طویل المدت تیاری اور پیش گوئی کی فراہمی کو یقینی بنائے گا۔کوآرڈینیشن سینٹر کی سربراہی وزیراعظم بطور چیئرمین کریں گے اور وزیر برائے منصوبہ بندی، ترقی اور خصوصی اقدامات اس کے ڈپٹی چیئرمین ہوں گے جبکہ کمانڈر آرمی ایئر ڈیفنس کمانڈ نیشنل کوآرڈی نیٹر کے طور پر کام کریں گے۔اقتصادی اُمور، خارجہ اُمور، داخلہ، خزانہ، موسمیاتی تبدیلی، مواصلات، وزیرمملکت برائے خزانہ، وزیراعظم کے مشیر برائے اسٹیبلشمنٹ، وزیراعظم کے کوآرڈینیٹر برائے اقتصادیات اور توانائی اور چیئرمین این ڈی ایم اے اس کے رُکن ہوں گے۔موجودہ مون سون سیزن کے دوران

پاکستان میں سیلابی صورتحال کی غیر معمولی نوعیت کے پیشِ نظر، وزیراعظم نے حالیہ سیلاب سے ہونے والی تباہی سے نمٹنے کے لیے قومی ردِعمل کو بہتر طور پر ہم آہنگ کرنے کے لیے قومی سطح کے رسپانس کوآرڈینیشن سینٹر کے قیام کی ہدایت کی تھی۔این ایف آر سی سی حکومتی اداروں، ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹیز اور ڈونرز کے درمیان ایک پل کا کام کرے گا تاکہ پورے پاکستان میں سیلاب سے متاثرہ افراد کی بحالی کے عمل کو یقینی بنایا جا سکے۔این ایف آر سی سی کا سیکرٹریٹ این سی او سی، ایرا ہیڈکوارٹر میں رکھا جائے گا اور یہ نیشنل کوآرڈی نیٹر کے تحت کام کرے گا۔این ایف آر سی سی کے ٹی او آرز میں بین الاقوامی اور دوطرفہ عطیہ دہندگان کے ساتھ انٹرفیس مہیا کرنا ہے تاکہ قومی امداد اور بحالی کی کوششوں کو فعال کرنے کے لیے مطلوبہ امداد اور بحالی کے وسائل کی دستیابی کو یقینی بنایا جا سکے۔مجموعی قومی ردِعمل کے ساتھ ان کی کوششوں کو مربوط کرنے میں مدد کے

لیے بین الاقوامی این جی اوز کے ساتھ انٹرفیس، امدادی اشیا کی مطلوبہ بین الاقوامی ومقامی خریداری کا آغاز، جیسا کہ ضروری ہو، این ایف آر سی سی کے ذریعے امدادی کارروائیوں کے ہموار انعقاد کے لیے پی ڈی ایم ایز کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنا، سفارتی برادری اور غیر ملکی صحافیوں کے دوروں کا بندوبست اور رابطہ کاری کرنا شامل ہیں۔ متعلقہ وزارتوں کے ساتھ ہم آہنگی میں، تازہ ترین معلومات اکٹھا کرنا اور ان کا تجزیہ کرنا اور مناسب ردِعمل کے لیے متعلقہ سٹیک ہولڈرز کے ساتھ اشتراک کرنا، ایک پُل کا کردار ادا کرتے ہوئے وفاقی اور صوبائی محکموں، ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹیز، عطیہ دہندگان اور مسلح افواج کے درمیان بہترین ہم آہنگی پیدا کرنا، جاری امدادی کارروائیوں کے سلسلے میں صوبائی کوششوں میں

سہولت فراہم کرنے کے لیے مطلوبہ وسائل کی دستیابی کی نگرانی یقینی بنانا، سرکاری محکموں، امدادی اشیا جمع کرنے کے مقامات اور دیگر مقامی عطیہ دہندگان سے امدادی اشیا کی وصولی کی کوششوں کو ہم آہنگ اور مربوط کرنا۔ استقبالیہ، پیکیجنگ اور امدادی سامان کی نقل وحمل کے لیے رابطہ کاری قائم کرنا۔ این ڈی ایم اے کے ساتھ بین الاقوامی عطیہ دہندگان سے عطیات کا حصول۔ مختلف سٹیک ہولڈرز کے ساتھ مل کر متاثرہ علاقوں کی فوری امدادی ضروریات کی نشاندہی کرنا۔ کثیر ایجنسیوں کے اسٹیک ہولڈرز کے ذریعے متاثرہ علاقوں کے ایک جامع مشترکہ سروے کا اہتمام کرنا تاکہ ریلیف امداد کی میرٹ کی بنیاد پر فراہمی کو ممکن بنایا جا سکے۔ حتمی قومی بحالی کے عمل کی نگرانی کرنا۔ تعمیر نو کے مختلف منصوبوں کو عمل درآمد کے قابل بنانے اور تباہ شدہ قومی انفراسٹرکچر کی بحالی اور تعمیر کے لیے ترجیح قائم کرنے کے لیے وسائل کی منصفانہ تقسیم کے ساتھ وفاقی

اورصوبائی اسٹیک ہولڈرز کے ساتھ ہم آہنگی کی منصوبہ بندی بھی اس کا حصہ ہوگی۔سرکاری نوٹیفکیشن کے مطابق این ایف آر سی سی وزیراعظم کو پیش رفت کی رپورٹوں کے ذریعے باقاعدگی سے اَپ ڈیٹ کرتا رہے گا۔متعلقہ وزارتوں کے مختلف سیکرٹریز،صوبائی حکومتوں،علاقائی اور مسلح افواج کے نمائندے این ایف آر سی سی کے مستقل اراکین ہوں گے۔تمام متعلقہ وزارتوں اور ڈویژنوں،صوبوں،آزاد جموں وکشمیر وگلگت بلتستان اور اداروں سے مزید درخواست کی گئی کہ وہ نیشنل فلڈ رسپانس اینڈ کوآرڈینیشن سینٹر کے لیے اپنے نمائندوں کو فوری طور پر نامزد کریں،حکومتی اتحادی جماعتوں کے مشترکہ اجلاس میں قرار دیا کہ ۶۰ سال میں ایسی تباہی نہیں ہوئی جو حالیہ بارشوں اور سیلاب کے نتیجے میں ملک

بھر بالخصوص صوبہ سندھ،بلوچستان،خیبر پختونخواہ،جنوبی پنجاب اور گلگت بلتستان میں ہوئی ہے۔وفاق کی جانب سے فوری طور پر سیلاب زدگان کی مدد کے لیے این ڈی ایم اے کو ۵ ارب روپے جاری کیے گئے جبکہ صوبہ سندھ کے لیے ۱۵ ارب،صوبہ بلوچستان اور صوبہ خیبر پختونخواہ کے لیے دس،دس ارب کی خصوصی گرانٹ بھی جاری کرنے کی منظوری دی گئی۔سیلاب میں ہلاک ہونے والے فرد کے اہل خانہ کو دس لاکھ روپے امداد کی منظوری دی گئی،اقوام متحدہ نے فوری طور پر پاکستان کے لیے ۱۶ کروڑ ڈالر کی ہنگامی امداد کی فراہمی کی اپیل کی ہے۔اس رقم سے ۵۲ لاکھ متاثرہ افراد کو خوراک،ادویات،پانی،ہنگامی صحت اور تعلیم کی سہولیات فراہم کی جائیں گی۔سعودی عرب،متحدہ عرب امارات،ترکی،قطر،چین،امریکا، برطانیہ،جاپان،جرمنی،فرانس،آسٹریلیا،کینیڈا،یورپی یونین کی جانب سے امدادی سامان پہنچنا شروع ہوگیا۔۳ ستمبر تک مختلف ممالک سے

سیلاب متاثرین کے لیے ۳۲ پروازیں پاکستان پہنچ چکی تھیں، پوری عالمی برادری نے پاکستان میں آنے والے ہولناک سیلاب پر گہرے دُکھ اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ عالمی برادری اور دوست ممالک نے ہر ممکن امداد کی فراہمی کی یقین دہانی کرائی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل انتونیو گوتریس کا کہنا تھا کہ ''پاکستان مشکلات میں گھر چکا ہے''۔ انہوں نے کہا کہ ''آئیں ہم ضرورت کی اس گھڑی میں پاکستان کے عوام کے ساتھ یکجہتی اور حمایت کا اظہار کرتے ہوئے قدم بڑھائیں۔ ہمیں ماحولیاتی تبدیلی کے تناظر میں اب اپنے سیارے کی تباہی کی جانب آنکھیں بند کر کے بڑھتے قدم روکنا ہوں گے''۔ امریکا نے سیلاب کی تباہ کاریوں سے نمٹنے کے لئے فوری طور پر ۳ کروڑ ڈالر کی امداد فراہم کی ہے اور مزید

امداد کی یقین دہانی کرائی ہے۔ حکومت نے این ڈی ایم اے اور صوبائی ڈیزاسٹر مینجمنٹ کو متاثرین کو امداد اور ریلیف کی فراہمی کے لیے جامع ایس او پی تیار کرنے کی ہدایت کی، جبکہ متاثرین کی درست تعداد معلوم کرنے کے لیے ہر ضلع کا نقشہ تیار کرنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔ بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کے ذریعے بھی متاثرہ خاندانوں کو فوری طور پر ۲۵ ہزار روپے فی خاندان تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ خیبر پختونخواہ کی پی ڈی ایم اے کے مطابق صوبے بھر میں سیلاب متاثرین کے لیے ۹۹ ریلیف کیمپس قائم کئے گئے ہیں، وزیرِ خارجہ بلاول بھٹو زرداری نے کہا ہے کہ آسٹریلیا اور سری لنکا کی مجموعی آبادی سے زیادہ پاکستان کی آبادی متاثر ہوئی ہے۔ سیلابوں سے تباہی کے ابتدائی جائزے کے بعد دنیا، اقوام متحدہ اور شراکت دار ایجنسیوں کو چیلنج کی شدت سے نمٹنے کے لئے فوری اقدامات کی ضرورت ہے۔

پاک فوج کے سربراہ جنرل قمر جاوید باجوہ نے سیلاب زدہ علاقوں کے دَورے کے موقع پر کہا ہے کہ سیلاب کی وجہ سے زیادہ مسئلہ بلوچستان میں ہے جہاں پورے کے پورے گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ سندھ میں ۴،۴ فٹ پانی کھڑا ہے، خیموں کی زیادہ ضرورت ہے۔ فوج کی طرف سے بھی خیمے فراہم کئے جارہے ہیں۔ این سی اوسی کی طرز پر ہیڈ کوارٹر بنایا گیا ہے جہاں امداد کا ڈیٹا اکٹھا ہوگا۔ ۲۰۱۰ء کے سیلاب میں بھی یہاں ایسی ہی تباہی ہوئی اور دوبارہ انہی جگہوں پر تعمیرات کرنے کی اجازت دے کر غفلت کا مظاہرہ کیا گیا۔ ذمہ داران کے خلاف قانونی کارروائی ہونی چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ سیلاب سے بڑے پیمانے پر ہونے والے نقصانات کے تخمینے کے لئے سروے ضلعی

انتظامیہ، صوبائی حکومتیں اور فوج مل کر کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ کالام میں کافی نقصان ہوا ہے، پل اور ہوٹل بہت تباہ ہوئے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ مختلف فلاحی اداروں، سیاسی جماعتوں اور افواج پاکستان نے اپنے ریلیف سنٹر کھولے ہوئے ہیں۔ ہیڈ کوارٹر سے وزیرِ منصوبہ بندی امداد اُدھر بھجوائیں گے جہاں ضرورت ہوگی۔ سیلاب زدگان کی بحالی اور امداد کے لیے آرمی چیف دوست ممالک سے مسلسل رابطے میں ہیں، فوجی جوان متاثرین کی مدد کے لیے دن رات کام کر رہے ہیں۔ ملک کے بالائی علاقوں میں مزید بارشوں کے نئے سلسلے کا امکان ہے جس سے سندھ کو نئے سیلاب اور سیلابی ریلے کا سامنا ہے۔ بارشوں اور سیلاب نے بھارت اور بنگلا دیش کو بھی متاثر کیا ہے لیکن ان ملکوں نے اپنے دریاؤں کے نظام پر بہت زیادہ ڈیم تعمیر کر کے سیلاب کی تباہ کاریوں میں کافی حد تک کمی کر لی ہے لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں جس طرح

دیگر تمام شعبے تنزلی کا شکار ہیں، گزشتہ ۳۰ سے ۴۰ برسوں میں کوئی طویل مدتی پالیسیوں کی منصوبہ بندی نہیں کی گئی اس لیے یہاں پر نہ صرف بڑے ڈیم نہیں بنائے جاسکے بلکہ نشیبی علاقوں کو سیلاب سے محفوظ کرنے کے لیے کوئی قابلِ ذکر عملی اقدامات بھی نہیں کیے گئے۔ اس کے علاوہ طویل مدتی منصوبہ بندی کا فقدان رہا ہے اور جو منصوبہ بندی ہوئی بھی تو اس پر عملدرآمد نہ ہوسکا۔ دوسری جانب ملک کے ماحولیات اور موسمیات کے پیشن گوئی نظام زیادہ مؤثر نہ ہونے کے باعث غیر متوقع بارشوں اور سیلاب سے آگاہی نہ دی جاسکی۔ اگر پاکستان کا محکمہ موسمیات بارشوں اور سیلاب کی بروقت غیر متوقع صورتحال سے آگاہ کرتا تو پیشگی حفاظتی اقدامات کیے جاسکتے تھے۔ پاکستان کا ماحولیاتی آلودگی میں ایک فیصد سے بھی کم حصہ

ہے لیکن پاکستان موسمیاتی تبدیلیوں کے اثرات سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے ممالک میں شامل ہے، پاکستان کو ماحولیاتی تبدیلیوں کے باعث آنے والے قدرتی آفات سے بچانا نہایت ضروری ہوگیا ہے۔ اس کے لیے دنیا کے امیر ترین ممالک اور ترقی یافتہ ممالک، جو ماحولیاتی تبدیلیوں کا باعث بن رہے ہیں ان کو آگے آنا ہوگا اور پاکستان میں ڈیموں کی تعمیر سمیت وسیع اقدامات کے لیے اربوں ڈالر کی امداد فراہم کرنی چاہیئے۔ پاکستان سمیت دیگر ترقی پذیر ممالک جن کو ماحولیاتی تبدیلیوں کے شدید اثرات کا سامنا ہے ان کے لیے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا ہنگامی اجلاس بلایا جانا چاہیں اور موسمیاتی تبدیلیوں کے باعث قدرتی آفات اور ان سے ہونے والے نقصان کی روک تھام کے لیے عالمی برادری کو مشترکہ لائحہ عمل مرتب کرنا ہوگا۔

صنفی تنوع، خواجہ سراء اور عوامی زندگی میں اُن کی شمولیت

امجد نذیر

مُغلیہ تمکنت سے لے کر سلطنتِ عثمانیہ تک کہ ثانی جن کی سطوت وشوکت کا کُرہِ ارض پر نہ تھا، صرف خواجہ سراء ہی ایسے کردار تھے جو حرم سراء کی مجالسِ طاؤس ورُباب یا نجی رازداریوں سے لے کر درگاہِ شاہی میں ہونے والے محاصروں، مقابلوں یا مزاحمت کے صلاح مشوروں اور آنٹ سانٹ سے باخبر ہوا کرتے تھے۔ گویا ظاہر میں دربان ٹھہرنے کے باوجود لٹھ برداری اُن کی باہر اور اندر حرم کے تسلیم کی جاتی تھی۔ اول الذکر دور میں ۱۸۷۱ء اور بعد الذکر میں کوئی ۱۹۲۴ء تک اُن کا یہ منصب قائم رہا۔ مگر یہ باتیں خواجہ سراؤں پر عصرِ حاضر کے سماجی المیے ٹوٹنے سے پہلے کی ہیں۔ تب اُن کے بارے میں لُغت تہذیب سے نہیں گِری تھی اور اِردگرد اُن کے نہ خوف کے ہی ہیولے تھے نہ تشویش کا دُھواں کہ شاید احترام آدمیت کا تھا، احساس شناخت کا اور مُقام نمایاں۔ راندہِ درگاہ ہونے سے پہلے وہ لال قلعہ اور توپ کاپی محل سے وابستہ ہستیاں ہی تصور ہوتی تھیں۔

اوراب یہ عالَم ہے کہ وہ بے شناخت روحیں، جنہوں نے اپنے جسم کی کوئی آلودگی نہیں دیکھی، گناہ کار اَفراد کی گناہ گار نظروں کی زد پر رہتی ہیں۔ اُن کی مُتغیر اِنسانیت کو سمجھتے ہوئے بالآخر یورپ نے انہیں معتبر ٹھہرایا، کلیسا میں پادری، جامعات میں اُستاد، دفاتر میں افسرانہ حیثیت، وراثت اور ازدوّاجیت کا بھی حق دے دیا۔ اور پھر اُن کی جِدوجہد کو تسلیم کرتے ہوئے ہم نے بھی ترقی پسندانہ قانونی بنیادیں رکھ دیں ہیں۔ عدالتِ عظمٰی نے ۲۰۱۱ء میں اُن کی اپنی شناخت کو مانتے ہوئے اُنہیں مساوی شہری تسلیم کرنے اور اُن کے لئے فلاحی پالیسیاں بنانے کا حکم صادر کر دیا۔ اور پارلیمانِ پاکستان نے بھی اپنی ممتاز قانون سازی ۲۰۱۸ء کے ذریعے اُن کے تمام سماجی، سیاسی، معاشی، اور نجی حقوق تسلیم کرتے

ہوئے وسائل فراہم کرنے کا عِند یہ دے دیا۔ مُندرجات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اِسے ایک بہترین قانون سازی قرار دیا جا سکتا ہے مگر روائتی سماج میں ابھی اُن کی بدلتی ہوئی رُوح، نکھرتے ہوئے ذہن اور جسم و قالب کے خلاف عصبیّت کا سلسلہ جاری ہے۔ اور ہم ابھی بھی اِس بحث میں غلطاں ہیں کہ خواجہ سراء زیادہ مرد ہیں یا زیادہ عورت؟ کتنے خودساختہ، اخلاق باختہ ہیں اور کتنے سچے اور کھرے؟ اُن سے پردہ کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا وہ شادی کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اُن کی نماز اور نمازِ جنازہ جائز ہے یا ناجائز؟ اُن کا مسجدوں میں داخل ہونا شرعی ہے کہ غیر شرعی؟ اور یہ کہ ناچ گانے اور جذبات بھڑکانے کے علاوہ وہ کوئی اور کام بھی کر سکتے ہیں یا نہیں؟ شناختی کارڈ کے لئے طبی مُعائنہ اور سند شرط ہے تا کہ اُن کی صنف پرکھی جا سکے۔ دوسری جانب حیاتیات دان بطن کے اندر لُونی حادثوں کے سبب صنفی تنوّع کی گیارہ اقسام تک بتاتے ہیں اور غالب

لہولہو کی جا چکی ہے۔ کچھ تیزاب گردی کا شکار ہوئے ہیں۔ کچھ گولیوں کے چھید سے ابتک چارپائی سے بندھے ہیں۔ کچھ بیساکھیوں پر چلتے ہیں اور بہت ایسے ہیں کہ ریشمی کفن اور خون کے دھبے اوڑھا کر سُلا دیے گئے ہیں۔

کہیں کام کی تلاش میں آنے والے خواجہ سراء سے لوگوں نے کہا، ''کام کو چھوڑو اور غیر قانونی کام کروں۔'' کہیں شیخ وناصح اُن کا جنازہ پڑھانے یا نہ پڑھانے پر مناظرے کرتے رہے۔ کہیں ہسپتال عملے کی مشکل یہ رہی کہ زخمی خواجہ سراء کو (جس پر قاتلانہ حملہ ہوا ہو) مرادنہ وارڈ میں داخل کیا جائے کہ زنانہ؟ کیونکہ لواحقین کو اعتراض ہر دو جانب تھا اور شدید تھا۔ سَمیر نے تو شاذ ہی ریشمی ملبوس زیبِ تن کیے تھے، مَسکارا لگایا تھا یا گُھنگرو باندھے تھے۔ مگر پھر بھی ''غیرت مندوں'' کو اُس کا وجود ناگوار تھا۔ ڈولفن کو تاک لگائے اُس کے سگے بھائی نے مار ڈالا۔

کیا یہ پوچھنا واجب نہیں بنتا کہ جب یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا ہے تو قانون وانصاف کس کَتبے تلے سو رہے ہوتے ہیں؟ پولیس والے کس وی آئی پی کی حفاظت پر مامور ہوتے ہیں؟ اور قانون کے ہاتھ چھوٹے کیوں پڑ جاتے ہیں؟ خیبر پختونخواہ میں تو گینگ کے گینگ خواجہ سراؤں کا سَر اُتارنا کارِثواب سمجھتے ہیں۔ اگر مظلوم، مشکوک کا نام لے تو بلیک میلنگ کا پھندا گلے تک آ پہنچتا ہے۔ ستم بالائے ستم نفسی دباؤ یا صحبت کے کارن کئی ایک خواجہ سراء آئس ہیروئن یا کسی اور نشے کے اثر میں آپس میں بھی دنگا فساد اور خون خرابے جیسے متفرق عارضوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ آرزو کہتی ہے، ''مجھے خواجہ سراؤں کے حقوق کی آواز اُٹھانے پر بھی مسلسل ہراساں کیا جاتا رہا ہے''۔

تو لیدی خصوصیت اُن میں سے ایک ہے۔ جبکہ ہم سے اُن کی سماجی دوئی ہضم نہیں ہو رہی۔ اسی بحث مُباحثے میں اُن میں سے کچھ بھول اُٹھے: ''رُوح ہماری نسوانی ہے، مردانہ جسم کے بندی خانے میں قید'' یا ''ہم عورت بھی ہیں اور مرد بھی''۔ ''نہ ہم اِدھر ہیں، نہ اُدھر، ہم درمیان میں ہیں اور فقط تیسرے''۔ تم ہماری خواہش کے بغیر ہماری شناخت کیسے مقرر کرو گے؟ حقیقت یہ ہے کہ نفسی اور بدنی بحث میں اُلجھے بغیر سماجی دائرہِ کار میں مرد اور عورت کے بعد، ایک انسان وہ بھی ہیں۔ بس یہ امرِ ربی ہے۔ سارا اَبہام اور اَدغام تیسرے جیوّن کی صف میں ڈال کر ہر حق اُن کا، ناطے اِنسان ہونے کے، جائز، قانونی اور مُسلمہ ہے۔ تاہم یہ بھی درست ہے کہ قدرت نے پیدائشی خواجہ سراء قلیل رکھے ہیں۔ پاکستان میں وہ قلیل ہیں یا کثیر، آگے بات بڑھانے سے پہلے ایک نظر لَت پَت معاشرتی صورت پر بھی لوٹ جاتی ہے۔

پیدائش کے بعد بلوغت اُن کے لئے گھر بدری، ٹھٹھہ مذاق، طنز و تفریح اور بالآخر گرو کی اَسیری کا باعث بنتی ہے۔ اور پھر زمانہ اُن کے لئے آزار، تماشہ، دُھتکار، سماجی دیس نکالے، وراثت بے دخلی اور حاشیہ آبادی کا استعارا بن جاتا ہے۔ کہانیاں بہت ہیں اور درد کی داستان طولانی، مگر سماج کے کینوس پر زندگی کے چند چھینٹے ڈالنا ہی کافی ہوگا: اکثر اوقات خواجہ سراء پیدا ہونا دکھوں کو بلاوا بھیجنے کے مترادف ثابت ہوتا ہے۔ بہن بھائیوں کی نفرین اور رقصِ جاں کُنی آس پاس منڈلاتا ہے۔ تشدد، آوازے، فقرے، جُگتیں، توہین، اغوا، دھمکیاں، ہراسگی اور جان سے مار دینا بھی عام ہے۔ مہرب معیز کی رائے میں علیشاء (۲۰۱۶ء) سے لے کر گُل پنرا (۲۰۲۰ء) اور سمیر (۲۰۲۲ء) تک بیسوں خواجہ سراؤں کی معصومیت

ساجھکاؤ رکھنے والے کو ورغلاتا اور آپریٹ کرواتا ہے؟ کون علاقے اور دھندے فروخت کرتا ہے؟ یعنی بہت مرتبہ دائرے کے اندر جبر واستحصال باہر سے کئی گنا زیادہ دیکھا گیا ہے۔ اگر وہ صوفیانہ فقر کے مسافر ہیں تو بتی چوک پر بھیک کون مانگ رہا ہوتا ہے؟ کیوں اپنی عُمر سے پہلے ہی وہ بیماریوں اور نقاہت کا شکار ہو کر سوسائٹی کا کوڑا کرکٹ بننے لگتے ہیں؟

کیا مُردہ احساس معاشرے نے اُنہیں وہاں لا کھڑا کیا ہے یا گرو چیلے کی کاروباری روایت، بعیانہ اور اَدل بدل نے؟ غربت نے یا کسی اَن کہی طلب نے؟ کب معلوم ہوگا یا سب کو سب معلوم ہے مگر.....؟ ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب سماجی زندگی کے کئی پہلو، کئی رنگ

ہیں تو صرف خواجہ سراؤں پر دارو غے کیوں بٹھائے جائیں؟۔ گویا کہیں نہ کہیں پدرسرانہ کلچر بھی تازیانے برسا رہا ہے؟ بہرحال معاشرے پر لازم آتا ہے کہ غیر قانونی سرگرمیوں کی بجائے ہنرفروشی کے لئے اُن کی جگہیں اور مواقع پیدا کریں۔ پھر باقی رُکاوٹیں ہٹتی چلی جائیں گی۔ مسائل حل ہونا شروع ہو جائیں گے۔ بس تھوڑا سا وقت لگے گا۔ خواجہ سراؤں کو مساوی شہری اور مساوی انسان منوانے کے لئے پولیس اور بالخصوص خیبر پختونخواہ پولیس کو حرکت میں آنا ہوگا۔ ایسے تمام گروہوں کو اور کاروباری گینگز کو، جو خواجہ سراؤں کو نشانہ بنا رہے ہیں، کٹہرے میں لانا ہوگا۔ میڈیا اور سوشل میڈیا کو مزید آواز اُٹھانی ہوگی، صحت اور تعلیم کے اداروں کو اُنکے بنیادی حقوق کو عملی جامہ پہنانا ہوگا۔ سرکاری اور نجی اداروں کو روزگار اور کاروبار کے لئے انہیں عام ''امیدوار'' تصور کرنا ہوگا۔

شاید کبھی کسی نے توجہ کی ہو کہ صوفیاء بھی، جن کا کلام پاکستان کے گھر گھر میں مقبول ومحبوب ہے، اپنے آپ کو عورت بلکہ دلہن تصور کر کے ربُّ العالمین سے اظہارِ عشق کرتے ہیں جیسا کہ: ''شوہ مِلے تے تھیواں نہال نی''۔ ''بلھے شاہ اساں تھیں وکھ نئیں۔ بِن شوہ دے دُوجا ککھ نئیں''۔ ''نہ رب تیرتھ، نہ رب مکے''۔ ''انجھ یا بُکل وچ کھیلے''۔ ''بلھے شاہ، شوہ اندروں مِلیا، بُھلی پھرے لوکائی''۔ ''کھسم آپے دا در نہ چھڈ دے، بھانویں وجن جُتے''۔ ''جس پایا بھیت قلندر دا، راہ کھوجیا آپے اندر دا'' (بلھے شاہ) اور ''عشق کیہ لاگے راہ دے نال، دل اَٹکیا بے پرواہ دے نال''۔ ''وے مادُھو میں وڈا تھیا بدنام''۔ ''مَیں رانجھن دی، رانجھن میرا''۔ میں وی جانا جھوک رانجھن دی''۔ ''رانجھن یار طبیب

دسبدا'' (شاہ حسین) اور دوسرے صوفیاء کے عشقیہ کلام میں مُرشد سے نیونہہ کی والہانہ تکرار سے واضح ہے۔ اکثر اوقات مرید (چیلہ) اپنے آپ کو طالب اور مرشد (گُرو) کو مطلوب بطور دیکھتا ہے اور اُسے رُوٹھے ہوئے معشوق کی طرح منانے، رجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا تیاگ کر الگ تھلگ اپنی بستی بسانا، اپنا طائفہ بنانا، اور ''انا الحق'' کی منزل سے پہلے سلُوک کے مراحل طے کرنا بھی تو صوفیوں کا شیوہ رہا ہے، ایمن جعفر اور کچھ صنفی تجزیہ کاروں کے خیال میں خواجہ سراء اور گرُو چیلے کا عشق بھی تو ایسے ہی تعلق اور تلاش کا اظہار ہے۔

لیکن مُکلف تضادات ایسی مبالغہ آمیزیوں کے پارچے کھول بچھاتے ہیں۔ اگر گرُو چیلے کا تعلق خدا رسیدہ پیر ومرشد اور مرید وسالک والا ہے تو چیلے کی محفل آرائیوں کے بعد گُرو تاوان کیوں طلب کرتا ہے؟ کون پیشہ اٹھاتا یا عملی طور پر ''حُسروں'' کی خرید وفروخت کرتا ہے؟ کون بس ذراء

گویا جُملہ اداروں کو ساتھ دینا ہوگا تا کہ ۲۰۱۱ء کے بہترین پالیسی احکامات اور ۲۰۱۸ء کی بہترین قانون سازی کا ثمرہ ہماری آبادی کے ایک اٹوٹ انگ تک بھی پہنچ سکے۔ وزارتِ انسانی حقوق، قومی کمشن برائے انسانی حقوق اور قومی کمشن برائے صنفی حقوق، اور سول سوسائٹی کو خصوصی تحقیق اور عملی سفارشات پیش کرنا ہوں گی تا کہ ملک اور معاشرے میں اُنکا مساوی انسانی وقار بُلند ہو سکے۔ لیکن اداروں اور پارلیمان سے پہلے اور بعد میں انکے حقوق والدین اور ان کے گھر والوں، محلے داروں اور ہمسایوں کو بھی تسلیم کرنے ہونگے۔ جب والدین اور گلی محلے کے ساتھی، ہمجولی اُن کو اپنانے لگیں گے تو معاشرہ، ادارے اور مستقبل آپ ہی آپ اُنہیں اپنا لے گا۔ جس کی پاکستان میں بہت ٹھوس اور قدآور ابتدا ہو چکی ہے۔

کیسا مثالی امر لگتا ہے جب نایاب جیسی خواجہ سراء ہمیں نباتیات اور عالمی تعلقات میں کوالیفائیڈ نظر آتی ہے، جس نے پہلے ٹرانسجینڈر سکول کی بنیاد ڈالی، پولیس کے لئے آپریٹنگ پروسیجر لکھے، ۲۰۱۸ء کے انتخابات میں عوامی نمائندگی کی جرأت کی اور اُسے عالمی گالا ز ایوارڈ (۲۰۲۰ء) کے لئے نامزد کیا گیا۔ فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں کام کرنیوّالی ڈاکٹر سارہ گل پاکستان کی پہلی خواجہ سراء ڈاکٹر ہے۔ بطور وکیل نِشاء راؤ عدالتی راہداریوں میں اب تک خواجہ سراؤں کے حقوق کی جنگ لڑ چکی ہے۔ جیّا اور خوشی ایک کامیاب ڈریس ڈیزائنرز ہیں، ریمل بہترین اور مہنگی ترین ماڈل ہے۔ جُولیا ایگزیکٹوّ منصب پر براجمان ہو کر نشانِ راہ بن رہی ہے۔ جُولی خان نے ''برہنہ حقیقت سیریز'' میں اپنی فلمز کے ذریعے کامیابی

سے اپنی کمیونٹی کے مسائل اور حقوق اُجاگر کر کے ہزاروں ناظرین کو متوجہ کیا ہے اور یہی کام مکالمے کے ذریعے کامی نے کیا ہے۔ ''خواجہ سراء سوسائٹی'' میں کام کرنے والی صائمہ کو کتھک، کلاسیکل اور بھارت ناٹیم میں مہارت کی وجہ سے ایک سے زیادہ اداروں نے ایوارڈز سے نوازا ہے۔ نغمہ اور لکی خان نے بطور گلوکار کوک سٹوڈیو میں منفرد کارکردگی دکھائی ہے۔ ''شی میل ایسوسی ایشن'' نے دارالامان تشکیل دے کر ان کے لئے گروؤں کی غلام گردشوں سے نجات کا راستہ تشکیل دیا ہے۔ اور ضعیف ''خواجہ سراؤں کا گھر'' بنانا کتنا احسن اقدام ہے۔

ایسی باہمت خواجہ سراؤں کو بھی درج بالا تمام حوصلہ شکنیوں کے سیلابوں سے گزرنا پڑا لیکن اُنہوں نے ہمت نہیں ہاری اور پاکستان کے بدلتے ہوئے معاشرے اور اداروں نے آگے بڑھنے کے لئے ان کا ساتھ دیا۔ ان کے احتجاج اور مطالبات کو بڑی حد تک تسلیم کیا ہے۔ ریڑھی بان پر اجیکٹ میں اُن کا کوٹہ رکھا گیا ہے۔ پنجاب پبلک سروسز اُن کی درخواستیں اُن کی شناخت کے ساتھ پراسس کرتا ہے۔ ادارہ سماجی تحفظ نے انہیں پناہ دینا شروع کر دی ہے۔ ملتان میں پہلے سرکاری ٹرانس سکول نے کام شروع کر دیا ہے۔ صحت اور تعلیم کے شعبوں میں اُنہیں ملازمت دی جارہی ہے۔ وزارتِ انسانی حقوق نے اُن کے لئے پہلا حفاظتی مرکز کھولا ہے۔ اور تو اور ۲۰۲۱ء میں پہلے خواجہ سراء مدرسے نے بھی کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

وہ وقت دور نہیں جب ہمیں اپنی تعداد کے متناسب تمام خواجہ سرائیں ڈاکٹرز یا انجینئر اور پولنگ ایجنٹ یا پولیس اور ایگزیکٹوز یا بزنس پرسن کے طور پر نظر آئیں گی۔ حتیٰ کہ آرکیٹیکٹ، انجینئر، شاعر، ادیب اور سیاستدان بھی۔

پاکستان میں کھیلوں کی حالتِ زار
پاکستان اور کامن ویلتھ گیمز

آفتاب احمد

کامن ویلتھ گیمز تاج برطانیہ کی سرپرستی میں ۱۹۳۰ء میں پہلی بار کھیلی گئیں جن کا انعقاد کینیڈا کے شہر اونٹاریو میں ہوا۔ ان میں کل ۱۱ ممالک نے حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد سے ہر چار سال بعد کامن ویلتھ گیمز منعقد کی جاتی ہیں ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۶ء میں دوسری عالمی جنگ کے باعث یہ گیمز نہیں ہوسکیں۔ امسال ۷۲ ممالک کی ٹیموں نے کامن ویلتھ گیمز میں حصہ لیا ہے۔ یہ اضافہ بتدریج ہوا ہے۔ موجودہ دور میں اسے اولمپک گیمز کے طرز پر کھیلا جارہا ہے اور یہ ایک ملٹی سپورٹس کمپیٹیشن بن کر اُبھرا ہے ۱۹۳۰ء میں اس کا آغاز برٹش ایمپائر گیمز کے نام سے ہوا تھا۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۶ء تک یہ گیمز برٹش ایمپائر اینڈ کامن ویلتھ گیمز کے نام سے چلتی رہیں ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۴ء میں ان گیمز کا نام برٹش کامن ویلتھ گیمز رکھ

دیا گیا اور اس کے بعد سے یہ کامن ویلتھ گیمز کے نام سے چل رہی ہیں۔ امسال ہونے والی کامن ویلتھ گیمز کا انعقاد برمنگھم میں ۲۸ جولائی سے ۸ اگست تک ہوا۔ جس میں کل ۷۲ ٹیموں نے شرکت کی اور ۱۹ گیمز کھیلے گئے۔ پاکستان نے اس سال کامن ویلتھ گیمز میں ٹوٹل ۸ میڈل حاصل کئے جس میں دو گولڈ تین چاندی اور تین کانسی کے تمغے شامل تھے اور مجموعی طور پر پاکستان ۱۸ ویں پوزیشن حاصل کر سکا جبکہ ہمارے ہمسایہ ملک بھارت نے ان گیمز میں ٹوٹل ۶۱ میڈل حاصل کر کے مجموعی طور پر چوتھی پوزیشن حاصل کی ہے۔ پاکستان میں سپورٹس کا معیار کیا ہے اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کامن ویلتھ گیمز میں کھیلے جانے والے ۱۹ کھیلوں میں سے پاکستان نے صرف بارہ کھیلوں میں حصہ لیا،

باقی ماندہ کھیلوں کے بارے میں پاکستان کے پاس کوئی کھلاڑی ہی موجود نہیں تھے یا کوئی انتظامی مسائل آڑے آئی ہے۔ کامن ویلتھ گیمز میں پاکستان کی تاریخ کچھ اس طرح ہے کہ پاکستان نے ۱۹۵۴ء میں پہلی بار کامن ویلتھ گیمز میں حصہ لیا اور ایک گولڈ میڈل، تین سلور اور دو کانسی کے تمغے حاصل کئے۔ ۱۹۵۸ء میں ٹوٹل ۱۰ میڈل حاصل کئے جس میں دو گولڈ تھے۔ ۱۹۶۲ء میں ۸ گولڈ میڈل اور ایک چاندی کا تمغہ حاصل کیا اور مجموعی طور پر اس سال پاکستان نے کامن ویلتھ گیمز میں چوتھی پوزیشن حاصل کی اور یہ پاکستان کے لئے کامن ویلتھ گیمز میں سب سے بہترین کارکردگی رہی۔ پاکستان نے ۱۹۶۶ء کے کامن ویلتھ گیمز میں ۴ سونے کے تمغے حاصل کئے ایک چاندی کا اور چار کانسی کے میڈل حاصل کیے۔ ۱۹۷۰ء میں پاکستان نے کامن ویلتھ گیمز میں حصہ لیتے ہوئے ۴ گولڈ ۳ سلور اور ۳ کانسی کے میڈل وصول کئے اس کے بعد ۱۹۷۴ء

سے ۱۹۸۶ء تک پاکستان کامن ویلتھ گیمز میں حصہ نہ لے سکا۔ ۱۹۹۰ء میں جب پاکستان نے دوبارہ کامن ویلتھ گیمز میں حصہ لیا تو بدقسمتی سے کارکردگی متاثر کن نہ رہی اور پاکستان کوئی میڈل حاصل نہ کر سکا۔ یہ پہلی بار تھا جب پاکستان کوئی بھی میڈل حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۸ء میں بھی پاکستان نے کوئی گولڈ میڈل حاصل نہ کیا بلکہ بالترتیب تین کانسی اور ایک چاندی کا تمغہ حاصل کیا۔ سال ۲۰۰۲ء میں پاکستان نے دوبارہ سے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک گولڈ سمیت ۸ میڈل حاصل کئے ۲۰۰۶ء میں ہونے والی کامن ویلتھ گیمز میں پاکستان نے ایک گولڈ میڈل تین چاندی اور ایک کانسی کا تمغہ اپنے نام کیا۔ ۲۰۱۰ء میں پاکستان نے دو گولڈ ایک چاندی اور ایک کانسی کا

تمغہ حاصل کیا۔ ۲۰۱۴ء میں پاکستان کوئی بھی گولڈ میڈل حاصل نہ کر سکا جبکہ تین چاندی اور ایک کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ ۲۰۱۸ء میں پاکستان نے ایک گولڈ میڈل اور چار کانسی کے تمغے حاصل کئے اور امسال پاکستان نے دو گولڈ، تین چاندی اور تین کانسی کے تمغے حاصل کئے اور اس طرح سال ۲۰۰۲ء کے بعد ۲۰۲۲ء میں پاکستان نے ٹوٹل ۸ میڈل حاصل کئے ہیں جو جاولن، ویٹ لفٹنگ، ریسلنگ اور جوڈو میں حاصل کئے گئے ہیں ۔ پاکستان نے چودہ بار کامن ویلتھ گیمز میں حصہ لیا مگر صرف ایک بار ٹاپ فائیو میں اپنی جگہ بنا سکا۔ ان تمام حقائق سے کیا یہ بات اخذ کی جائے کہ پاکستان کے پاس ٹیلنٹ کی کمی ہے یا انتظامی مسائل توجہ طلب ہے۔ ٹیلنٹ کی کمی تو ماننے میں نہیں آتی کیونکہ بقول شاعر۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اس کا مطلب ہوا کہ پالیسی سازی میں مسائل حل کرنے کی ضرورت ہے یہاں نہ تو کچھ کر دکھانے والوں کو مواقع میسر ہوتے ہیں اور نہ

ہی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں موجودہ صورتحال میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ پاکستان میں صرف ایک ہی سپورٹس باقی ہے جس کا نام کرکٹ ہے۔ پاکستان کے قومی کھیل کے نام سے معروف کھیل ہاکی جس میں پاکستان چار بار ورلڈ چمپیئن رہا آج اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ سکواش میں پاکستان کے پلیئرز نے مسلسل ورلڈ چمپیئن کا ٹائٹل اپنے نام کر کے ملک کا نام روشن کیا مگر آج وہ بھی زبوں حالی کا شکار ہے اور اس کا کہیں نام بھی دکھائی نہیں دیتا۔ سنوکر کے میدان میں بھی پاکستان کے پلیئرز نے اپنا لوہا منوایا۔ کوئی بھی ان وجوہات کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ مسلسل بین الاقوامی سطح پر کامیابیاں حاصل کرنے والے کھیل میں ایسا کیا ہو جاتا ہے کہ انہی گیمز میں کوالیفائی کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے سپورٹس کے ہر

شعبے میں پاکستان کے پاس ٹیلنٹ کی صورت میں بے بہا خزانے موجود ہیں مگر کوئی جوہری بھی تو ہو جو ان کی پرکھ کر کے ان کو بین الاقوامی معیار کے مطابق ڈھال کر ان کو میدان میں اُتارے۔ کوئی تو ایسا پالیسی ساز ہو جو محض سپورٹس کے بارے میں سوچے تا کہ پاکستان کا نام دنیا میں روشن ہو کب وہ وقت آئے گا جب ادارہ جاتی اصلاحات کی جائیں گی اور اس میدان میں سیاست کے عمل دخل کو کم کیا جائے گا۔ تب پاکستان کے نوجوانوں کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملے گا۔ کب ہمارے نوجوانوں کو بین الاقوامی معیار کے مطابق سہولیات اور مواقع میسر ہونگے؟ ارباب اختیار کے لئے یہ لمحہ فکریہ ہے اگر اب بھی ہم نے اپنی صفوں کو درست نہیں کیا تو بقول شاعر تمہاری داستان بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

ہنگامی بنیادوں پر زرعی اصلاحات کا فیصلہ

عابد گوندل

پاکستان جیسا زرعی ملک جو سبزیاں، پھل اور مختلف قسم کی اجناس برآمد کر کے اپنی معیشت کو سہارا دیتا تھا اسے ۲۰۲۱ء میں ۱۹ ارب ڈالر کے لگ بھگ اجناس درآمد کرنا پڑیں۔ جبکہ دوسری جانب ملک بھر میں ہونے والی شدید بارشوں اور اس کے نتیجے میں آنے والے سیلاب کے باعث ملکی زراعت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے جس سے یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ آئندہ بھی ہمیں غذائی ضروریات پوری کرنے کے لئے اجناس درآمد کرنا پڑیں گی جس کا نتیجہ تجارتی خسارہ بڑھنے کی صورت میں نظر آئے گا اور ملکی معیشت پر مزید منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وزیراعظم میاں محمد شہباز شریف کی زیرصدارت اجلاس میں ہنگامی بنیادوں پر زرعی اصلاحات کا فیصلہ کیا گیا۔ وزیراعظم کا کہنا تھا کہ حکومت ترجیحی بنیادوں پر کسانوں کو تمام ضروری سہولیات فراہم کرے گی، کم لاگت پر بروقت معیاری بیج اور کھاد کی فراہمی کو یقینی بنایا جائیگا جبکہ غیر معیاری بیج اور پیسٹی سائیڈ بیچنے والی کمپنیوں کا سدباب کیا جائیگا جبکہ مقامی سطح پر معیاری بیج کی پیداوار کے لئے زرعی تحقیقی اداروں کو سہولیات

فراہم کی جائیں گی۔

قیام پاکستان سے تاحال زراعت کو پاکستان کی معیشت میں بنیادی حیثیت رہی ہے۔مجموعی قومی پیداوار میں زراعت کا حصہ ۲۱ فیصد ہے اور کل ملکی لیبر فورس کا ۴۴ فیصد زراعت کے شعبے سے وابستہ ہے۔ پاکستان کا کل رقبہ ۷۹٫۶ ملین ایکڑ ہے جس میں سے ۲۳٫۷۷ ملین ایکڑ زرعی رقبہ ہے جو کل رقبے کا ۲۸ فیصد بنتا ہے۔اس میں سے بھی ۸ ملین ایکڑ رقبہ زیر کاشت نہ ہونے کے باعث بے کار پڑا ہے۔ پاکستان کی ۷۵ فیصد سے زائد آبادی زراعت کے پیشے سے منسلک ہے۔ملک کی مجموعی قومی پیداوار میں زراعت کا حصہ ۲۱ فیصد ہے۔زراعت کا شعبہ لوگوں کو خوراک

اور صنعتوں کو خام مال کی فراہمی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستانی برآمدات سے حاصل ہونے والے زرِمبادلہ کا ۴۵ فیصد زرعی تجارت سے حاصل ہوتا ہے۔ کپاس، گندم، گنا اور چاول کی فصل بیرونی منڈیوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔مگر ملکی زرعی شعبے کی ترقی کی رفتار نہایت سست ہونے کی وجہ سے پاکستان کے مقابلے میں دنیا کے دیگر ملک زیادہ پیداوار دے رہے ہیں۔اگر زرعی ترقی میں حائل رکاوٹوں پر غور کیا جائے تو کئی وجوہات سامنے آتی ہیں۔کسان مہنگائی کا شکار ہیں۔کھاد کے علاوہ زرعی لوازمات بھی ڈیزل اور مٹی کے تیل کی قیمتوں میں اضافے کے باعث مہنگے ہو رہے ہیں۔موجودہ حالات میں کسان کھیتی باڑی کے بجائے اپنی زرعی زمینیں فروخت کر کے شہروں میں منتقل ہو رہے ہیں۔

زراعت خود کفالت کا بہترین ذریعہ ہے۔زرعی شعبہ ملک کی آبادی کو خوراک مہیا کرتا ہے اور یہی پاکستان کی آبادی کے روزگار کا سب

سے بڑا ذریعہ ہے۔ پاکستان کی زرعی حکمت عملی میں خود کفالت کے اصولوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ زراعت پاکستان کے لیے ایک جڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن زرعی شعبے کا حصہ ہماری معیشت میں کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت ملک کی جی ڈی پی میں زراعت کا حصہ تقریباً ۱۸ فیصد ہے۔ اس کے علاوہ جی ڈی پی میں ۲۰ فیصد انڈسٹری اور ۶۰ فیصد سروسز کا حصہ ہے۔ ملک کی آبادی کا بڑا حصہ زرعی شعبے سے وابستہ ہے اور زراعت ان کے روزگار کا اہم جزو ہے۔ اس وقت ملک کو جو سب سے بڑا چیلنج درپیش ہے وہ پانی ہے۔ پانی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے ہمیں اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ پانی کی قلت کے باعث کاشتکاروں کو فصلوں کی کاشت میں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے باعث

ہر آنے والے سال میں یا تو فصلوں کی پیداوار میں کمی آ رہی ہے یا پھر فصلوں کی کوالٹی متاثر ہو رہی ہے۔ اچھی فصل کے حصول کے لیے مناسب اور بروقت پانی بہت زیادہ ضروری ہے۔ ہمارے کاشتکاروں اور کسانوں کی اکثریت غیر تعلیم یافتہ ہے اور انہیں جدید طریقوں سے آگاہی حاصل نہیں ہے۔ انہیں جراثیم کش ادویات کے استعمال، معیاری بیجوں کے انتخاب اور مصنوعی کھاد کے مناسب استعمال کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی فی ایکڑ پیداوار ملکی ضروریات کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ وہ کاشتکاری کے صرف ان روایتی طریقوں پر یقین رکھتے ہیں جو انہوں نے اپنے بزرگوں سے سیکھے ہیں۔ نئی اور جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے کسان بہتر پیداوار حاصل کر سکتے ہیں مگر اس کے لیے کسانوں اور کاشتکاروں کو آگاہ کرنے کی ضرورت ہے اس کے علاوہ زراعت کے شعبہ کی ترقی کے سلسلہ میں بہتر اقدامات کیے جائیں

اور سیلاب کی صورت حال کے پیش نظر ایسی حکمت عملی بنائی جائے جس سے ان علاقوں کو محفوظ رکھا جا سکے جو زیرِ کاشت ہیں۔ ڈیم کا بننا ہمارے لیے اس وقت اشد ضروری ہے کیونکہ اس سے سیلاب کو کافی حد تک روکا جا سکتا ہے اور پانی کو ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر حکومت زراعت کے شعبہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کو اپنی ترجیحات میں شامل کر لے اور اس کے گوناگوں مسائل پر توجہ دے تو یہ بآسانی حل ہو سکتے ہیں۔ اس سے زراعت کا شعبہ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے گا۔ یوں پاکستان خوش حال ہوگا اور اس کے عوام آسودہ ہوں گے۔

پاکستان قدرتی وسائل سے مالا مال ملک ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے وافر افرادی قوت سے بھی نوازا ہے جو باصلاحیت اور ہُنر مند ہے۔ کمی

صرف باہمت اور پُرعزم قیادت کی ہے جو دیانتدار ہو اور پاکستان سے مخلص بھی ہو۔ پاکستان واحد ملک ہے جہاں زرعی آلات پر ٹیکس عائد ہے۔ زراعت کے شعبے کو ترجیحی بنیادوں پر توجہ دی جانی چاہیے، ورنہ عدم توجہی کے باعث یہ شعبہ مزید متاثر ہوگا۔ حکومت کو زراعت کی ترقی کے لیے انفراسٹرکچر پر توجہ دینی چاہیے۔ ہمارا ملک زراعت کے شعبے میں جب ہی ترقی کر سکتا ہے جب نیک نیتی سے زرعی شعبے کی ترقی پر توجہ دی جائے گی اور زرعی ترقی کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔

۱۹۶۰ء میں سبز انقلاب کا آغاز ہوا۔ سبز انقلاب کا تصور سب سے پہلے یو ایس ایڈ کے سابق ڈائریکٹر ولیم گاڈ نے دیا۔ سبز انقلاب کا تصور ترقی پذیر ممالک میں کسانوں کی مدد کے لئے کیا گیا تھا۔ اس اصطلاح کا استعمال امریکہ میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء کے دوران زرعی پیداوار میں

اضافے کو بیان کرنے کے لئے کیا گیا۔امریکہ میں گرین انقلاب کی تکنیک کی کامیابی کے بعد، اگلا قدم انہیں دوسرے ممالک میں پھیلانا تھا جس کے لئے ٹیکنولوجیکل پیکیجز کے نام سے زرعی طریقوں کا ایک سلسلہ سامنے آیا۔جنہیں ہر ملک نے زرعی برادری اور پیداواری کمپنیوں کے تعاون سے فروغ دیا۔اس کا آغاز ۱۹۶۳ء میں ہوا۔اسی سال ایف اے او نے ورلڈ فوڈ کانگریس کا اہتمام کیا جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ پوری دنیا میں زرعی ترقیاتی منصوبے کا آغاز کیا جائے۔اس منصوبے کی حمایت فورڈ اور راک فیلر فاؤنڈیشن نے کی۔اس پروگرام کے تحت ممالک کو زراعت میں گہری تبدیلیاں کرنے کی ترغیب دی گئی۔مقصد یہ تھا کہ وہ پیداوار اور منافع کو بڑھانے کے لئے کیمیکل کھادوں پر منحصر مونو کلچر

ماڈل کو اپنائیں۔پاکستان میں سبز انقلاب کے زمانے میں مشینی کاشت اور زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی ایسی قسمیں دریافت ہوئیں جن کی وجہ سے فی ایکڑ پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔اسی زمانے میں بڑے بڑے آبی ذخائر تعمیر کیے گئے۔نتیجتاً گندم، چاول اور دیگر فصلوں کی فی ایکڑ پیداوار بھی بڑھی۔اس عرصے میں غذائی اشیاء کی پیداوار میں اضافے کی شرح آبادی میں اضافے کی رفتار سے زیادہ تھی۔غذائی اشیاء کی پیداوار اوسطاً ۴ فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھی جبکہ آبادی میں اضافے کی شرح ۲٫۵ فیصد سالانہ تھی۔پیداوار میں تیز رفتار اضافے کی وجہ سے نہ صرف بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری ہوتی رہیں بلکہ فاضل پیداوار کی وجہ سے برآمدات میں بھی اضافہ ہوا اور ہم بہت ہی کامیاب زرمبادلہ کمانے کے قابل ہو گئے۔لیکن پچھلے ۳۵ سالوں سے زراعت کے شعبے میں بہت ہی پست شرح سے اضافہ ہوا۔۱۹۸۰ء سے لے کر آج

تک غذائی اشیاء کی پیداوار میں صرف ۷۹ء۱ فیصد کی شرح سے اضافہ ہوا ہے جبکہ پاکستان کی آبادی ۲ء۵ فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھتی ہے۔ پاکستان زیرِ کاشت رقبے میں اضافہ کر کے اس رَخنے کو پورا کرتا رہا ہے۔ اس طرح ہم فوڈ انسیکیوریٹی کو مؤخر کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب تازہ پانی کے بہاؤ اور آبی ذخائر میں پانی کی کمی اور واٹر ٹیبل کی گراوٹ کی وجہ سے مزید زمین زیرِ کاشت لانا مشکل ہے۔

لینڈ ریفارمز کے بغیر زرعی شعبے کی ترقی ناممکن ہے۔ ستر کی دہائی کے بعد زرعی اصلاحات کی جانب پیش رفت نہ ہونے کی وجہ سے زراعت کو زبردست نقصان پہنچا۔ کاشتکاروں کی آمدنی کم اور اشیائے خورد و نوش کے اخراجات بہت بڑھ گئے۔ پاکستان میں ۲۳ فیصد زرعی رقبہ ایک

فیصد مراعات یافتہ افراد کی ملکیت ہے جن کی فلاح و بہبود پر بھرپور توجہ دی جاتی ہے جبکہ ۴۳ فی صد رقبہ ان کاشتکاروں کی ملکیت ہے جو چند ایکڑ کے مالک ہیں جن کی کوئی نہیں سنتا۔ ملک میں صرف گندم اور گنّے کی امدادی قیمت کا اعلان کیا جاتا ہے جبکہ دیگر فصلوں پر توجہ نہیں دی جاتی۔ اداروں کی عدم توجہ کی وجہ سے بااثر شوگر لابی نے ۲۰۰۴ء۔۲۰۰۵ء سے اب تک گنے کے زیرِ کاشت رقبہ میں چودہ فیصد اضافہ کیا، جس کی وجہ سے کپاس کے زیرِ کاشت رقبے میں ۲۶ فیصد کمی آئی جس سے ٹیکسٹائل سیکٹر اور اس سے وابستہ لاکھوں افراد متاثر ہوئے۔

زراعت کے شعبے کی بہتری میں بڑی رُکاوٹ ہمارا ناقص نظامِ اراضی ہے۔ ۱۹۵۹ء اور ۱۹۷۲ء کی لینڈ ریفارم کے تحت نظامِ اراضی کے ان نقائص کو دُور کرنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۵۹ء میں زمین کی زیادہ سے زیادہ حدِ آبپاشی زمین کی صورت میں ۱۵۰۰ ایکڑ اور غیر آبپاشی کی صورت

میں ۱۱۰۰۰ ایکڑ مقرر کی گئی۔ ۱۹۷۲ء میں یہ حد مزید گھٹا کر آبپاشی زمین کی صورت میں ۱۱۵۰ ایکڑ اور غیر آبپاشی کی صورت میں ۱۳۰۰ ایکڑ کر دی گئی۔ ان حدود سے زائد زمین پر بڑے زمینداروں سے واپس لے کر بے زمین کاشتکاروں میں تقسیم کر دی گئی۔ ۱۹۷۶ء کی اصلاحات کے تحت سرکاری زمینیں بے زمین کاشتکاروں یا قابلِ گزارہ قطعات سے کم زمین کے مالک کاشتکاروں میں تقسیم کی گئیں اور ۱۹۷۷ء میں زمین کی زیادہ سے زیادہ حد گرا کر آبپاشی زمین کی صورت میں ۱۱۰۰ ایکڑ اور غیر آبپاشی کی صورت میں ۱۲۰۰ ایکڑ کر دی گئی۔ ۱۹۵۹ء کی اصلاحات کے تحت ۱۰۱ ملین ایکڑ زمین بڑے زمینداروں سے واپس لی گئی جس میں صرف ۵ء۰ ملین ایکڑ قابلِ کاشت تھی۔ ۱۹۷۲ء کی اصلاحات کے تحت ۳ء۱ ملین ایکڑ بڑے

زمینداروں سے واپس ملی جس میں صرف ۷ء۰ ملین قابل کاشت تھی۔ اس طرح ان اصلاحات سے پاکستان کے کل قابل کاشت رقبے کا صرف ۸ فیصد زمینداروں سے واپس لیا جا سکا اور اس میں بھی اس رقبے کا نصف حصہ بے زمین کاشتکاروں کو منتقل کیا جا سکا۔ ۱۹۹۰ء کی زراعت شماری کے مطابق ۱۹ فیصد کھیتوں پر اب بھی مزارعین کاشت کرتے ہیں۔ ۲۰۰۰ء کی زراعت شماری کے مطابق قابل کاشت رقبے کی ۵۰ فیصد سے زیادہ زمین ۱۰ فیصد سے بھی کم بڑے زمینداروں کے قبضے میں ہے یعنی ۱۹۶۰ء میں جو صورتِ حال تھی اس میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔ زرعی ادارہ شماریات کے مطابق ہر سال ۴۰ فیصد قابلِ کاشت رقبے پر کاشت نہیں کی جاتی اور اس زمین کی دو تہائی ملکیت بڑے زمینداروں کے پاس ہے۔ اس سے بڑے فارموں کی مینجمنٹ کی خامیوں اور غیر معیاری کارکردگی کی نشاندہی ہوتی ہے اس کے برعکس چھوٹے فارموں کی ۹۰ فیصد

زمین پر کاشت کی جاتی ہے اور ہر ایک ایکڑ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

زرعی ملک ہونے کے باوجود پاکستان کی زراعت خطے میں پسماندہ ترین شمار ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس پسماندگی کی وجوہات پر سینکڑوں رپورٹس مرتب ہوئیں، اور اس کی بہتری کے لئے متعدد احکامات بھی سامنے آئے لیکن نہ تو زراعت میں بہتری آئی اور نہ ہی کسان کی حالت بدلی۔ گزشتہ چند عشروں کے دوران زرعی شعبے میں اہم ساختیاتی تبدیلیاں رُونما ہوئی ہیں۔ فصلوں کی پیداوار کا حجم زراعت میں سب سے اہم ہے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء تک ویلیو ایڈڈ، اکاؤنٹنگ کے لحاظ سے کپاس تقریباً گندم کی طرح اہم ہو چکی تھی جو فصل کی کل آمدنی کا ۲۸ فیصد تھی۔ کپاس کی

کاشت میں اضافہ ہوا کیونکہ پاکستان کی ٹیکسٹائل انڈسٹری نے اسے سہارا دیا۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل سے اس پر انحصار بڑھتا گیا۔ گذشتہ ادوار میں حکومتوں نے مراعات فراہم کر کے ٹیکسٹائل کی صنعت کو ایک بار پھر ریکارڈ منافع بخش بنایا۔ اس دوران سبزیوں اور پھلوں کی برآمدی صلاحیت کو نظر انداز کر کے زراعت پیشہ افراد کا استحصال کیا جاتا رہا ہے۔ نئے بیجوں، کھاد اور ٹریکٹر کی وجہ سے فصلوں کی پیداواری صلاحیت میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔ کپاس کے علاوہ گندم پاکستان میں سب سے اہم غذائی اناج ہے۔ کچھ گندم مرغیوں اور مویشیوں کو بھی کھلائی جاتی ہے۔ ۱۹۹۴ء میں تقریباً ۸٫۲ ملین ہیکٹر رقبہ پر گندم کاشت ہوئی۔ ۱۹۸۳ء میں پیداوار صرف ۷۰۰ کلوگرام فی ہیکٹر سے بڑھ کر ۱۹۹۴ء میں ۲۰۰۰ کلوگرام سے زیادہ ہو گئی۔

انٹرنیشنل فوڈ پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے جولائی ۲۰۱۱ء میں پاکستان سٹریٹیجی سپورٹ پروگرام کا آغاز کیا۔ امریکہ کے ادارہ برائے بین الاقوامی ترقی (یو ایس ایڈ) نے زراعت اور اس سے منسلک ذیلی شعبوں میں حکومت پاکستان کی مدد کے لیے فنڈ فراہم کیا۔ لیکن عدم دلچسپی اور غذائی تحفظ کو متاثر کرنے والے متعدد مسائل کی وجہ سے یہ پروگرام حسب توقع نتائج نہ دے سکا۔ پاکستان ایگریکلچرل کیپیسٹی اینہانسمنٹ (پی اے سی ای) پروگرام، یو ایس ایڈ کے تعاون سے چلنے والا ایک اور پروگرام تھا جو اکتوبر ۲۰۱۶ء میں پی ایس ایس پی کے بعد لایا گیا۔ پی اے سی ای فی الحال آئی ایف پی آر آئی کے زیرِ عمل ہے۔ یہ پروگرام ۲۰۱۰ء میں نافذ کی گئی ۱۸ویں آئینی ترمیم سے متعلق تبدیلیوں سے نمٹنے کے لیے تمام

صوبائی حکومتوں کے زراعت کے محکموں کی مدد کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے اور اس شعبے میں قومی اہداف اور مقاصد حاصل کرنا اس کا ہدف ہے۔ جولائی ۲۰۲۲ء میں عالمی بینک کے بورڈ آف ایگزیکٹو ڈائریکٹرز نے پاکستان کو زرعی شعبے میں تبدیلی لانے کے لیے ۲۰۰ ملین ڈالر کی فنانسنگ کی منظوری دی ہے تاکہ ماحولیات کے لیے سمارٹ ٹیکنالوجیز کو اپنا کر پانی کے استعمال کی صلاحیت کو بہتر بنایا جا سکے۔ پنجاب میں زرعی شعبہ پاکستان کی معیشت اور غذائی تحفظ میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ ملک کی مجموعی غذائی پیداوار کا ۳۷ فیصد ہے۔ پنجاب ریزیلینٹ اینڈ انکلوسیو ایگریکلچر ٹرانسفارمیشن پروجیکٹ (پی آر آئی اے ٹی) چھوٹے کھیتوں کے لیے پانی تک مؤثر اور مساوی رسائی کے ذریعے زرعی پیداوار میں اضافہ کا پروگرام ہے۔ یہ کمیونٹی اور گھریلو سطح پر کسانوں کو موسمیاتی سمارٹ فارمنگ کے طریقوں اور ٹیکنالوجیز کو اپنانے میں مدد دے گا۔

پاکستان میں سب سے زیادہ زرعی صوبہ پنجاب ہے جہاں گندم اور کپاس سب سے زیادہ کاشت کی جاتی ہے۔آم کے باغات زیادہ تر سندھ اور پنجاب میں پائے جاتے ہیں جو پاکستان کو آم کی پیداوار میں دنیا کا چوتھا بڑا ملک بناتے ہیں۔تمباکو کی کاشت بنیادی طور پر خیبر پختونخواہ اور پنجاب میں کی جاتی ہے اور یہ ایک اہم فصل ہے۔سب سے اہم فصلیں گندم، گنّے، کپاس اور چاول کی ہیں جو مجموعی طور پر فصلوں کی پیداوار کی قیمت کا ۷۵ فیصد سے زیادہ ہیں۔ پاکستان کی سب سے بڑی غذائی فصل گندم ہے۔ پاکستان غذائی اجناس کا برآمد کنندہ ہے، سوائے کبھی کبھار کے جب اس کی فصل خشک سالی سے بُری طرح متاثر ہوتی ہے۔ پاکستان چاول، کپاس، مچھلی، پھل اور سبزیاں برآمد کرتا ہے اور سبزیوں کا تیل،

گندم، دالیں اور دیگر اشیا کی درآمد کرتا ہے۔ پاکستان کی زراعت کی زیادہ تر پیداوار کا استعمال ملک کی بڑھتی ہوئی پروسیسڈ فوڈ انڈسٹری کے ذریعہ ہوتا ہے۔ پاکستان میں کسانوں کو مختلف معاشی، اقتصادی، قدرتی، سماجی و اقتصادی اور مالی مسائل درپیش ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر جدید مشینری کا استعمال مشکل ہے۔ پاکستان میں زراعت کی میکانائزیشن میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن زیادہ تر علاقوں میں پرانے سامان ابھی بھی زرعی پیداوار کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔ پاکستان میں کل زرعی یونیورسٹیاں اور کالج صرف ۱۶ ہیں اور پیداوار کی قدیم تکنیک بین الاقوامی سطح کے مطابق پیداوار میں اضافہ نہیں کر سکتی۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی پیداوار کی سطح کے مقابلے میں پاکستان میں اوسط فصل کی پیداوار بہت کم ہے۔ زرعی پیداوار کی صلاحیت کو بڑھانے کے لئے، زرعی نمو کی تحقیق میں مستقل بہتری ہونی

چاہئے۔ایک یا دو فصلوں کی مستقل کاشت مٹی کی زرخیزی کو ختم کرتی ہے۔زرخیزی کی بحالی کے لئے فصلوں کی مناسب گردش ضروری ہے۔ مختلف زرعی فصلیں جیسے کپاس، گنّے، تمباکو، گندم اور چاول اکثر بیماری اور کیڑوں کے حملے کی زد میں آتے ہیں۔کیڑوں اور پودوں کے امراض زراعت کی سالانہ پیداوار کو کم کرتے ہیں۔زرعی شعبے میں مشترکہ خاندانی نظام بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ہمارا کسان غریب ہے۔دوسری طرف اسے اپنے بڑے کنبے کی کفالت کرنا ہے۔اس سے بچت اور سرمایہ کاری میں کمی پیدا ہوتی ہے۔کسان کی پیداوار کا ایک بہت بڑا حصہ اس کے اپنے گھر میں کھایا جاتا ہے۔ہمارے ملک میں بیشتر کسان، مزدور اور کرایہ دار ناخواندہ ہیں۔وہ زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لئے غیر تربیت یافتہ اور غیر مؤثر ہیں۔زرعی سامان کی قیمتوں کا بازار عام طور پر ملک میں غیر مستحکم رہتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سال میں ایک شے کی قیمت بہت زیادہ ہے اور اگلے سال میں بہت کم ہے اور اس کے برعکس کسانوں کو اپنی پیداوار کی فروخت سے مناسب معاوضہ نہیں ملتا جو کسانوں کے مسائل کی بنیادی وجہ ہے اور کسان غیر مطمئن رہتے ہیں۔اس لئے زرعی قرضوں کی فراہمی، آبی لاگت، ڈیموں کی تعمیر، زرعی تحقیق، زرعی بنیادوں پر صنعتوں، ٹیکس مراعات اور کسانوں کی تربیت پر توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ کسانوں کو خوشحال بنا کر زرعی مصنوعات کے میدان میں مزید کامیابیاں حاصل کی جاسکیں۔

یہ حقیقت ہے کہ زراعت ملکی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے لیکن صد حیف کہ اس شعبہ پر کسی دور میں بھی توجہ دینے کی زحمت گوارا نہ کی گئی۔جس سے اس کی ایک تہائی آبادی کا روزگار وابستہ ہے نتیجہ زراعت اور معیشت کی ابتری کی صورت میں سامنے ہے۔دنیا کا بہترین نہری نظام اور زرخیز ترین زمین کے باوجود زرعی درآمدات میں تشویشناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے، صرف گزشتہ مالی سال میں فوڈ آئٹمز کی درآمدات پر جو رقم صرف ہوئی اگر زراعت کے لئے استعمال کی جائے تو پاکستان اس شعبے میں نہ صرف خود کفیل ہوسکتا ہے بلکہ پھر سے زرعی اشیا کا برآمد کنندہ بن سکتا ہے۔

پاک جمہوریت

نمبر شمار	مطبوعات	زبان	قیمت پاکستانی روپے	قیمت امریکی ڈالر
1	قائداعظم محمد علی جناح خطبات اور ارشادات بطور گورنر جنرل ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء (مجلد)	انگریزی	150/-	$-05
2	قائداعظم محمد علی جناح خطبات اور ارشادات بطور گورنر جنرل ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء (پیپر بیگ)	انگریزی	150/-	$-05
3	قائداعظم محمد علی جناح خطبات اور ارشادات بطور گورنر جنرل ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء (پیپر بیگ)	اُردو	350/-	$-17
4	قائداعظم محمد علی جناح (تصویری البم) ۱۸۷۶ء تا ۱۹۴۸ء (مجلد)	انگریزی	350/-	$-17
5	قائداعظم محمد علی جناح (تصوری البم) ۱۸۷۶ء تا ۱۹۴۸ء (پیپر بیگ)	انگریزی	350/-	$-17
6	قائداعظم کے سنہری اقوال	انگریزی	100/-	$-04
7	اقوال قائد (پیپر بیگ)	انگریزی	50/-	$-03
8	قائداعظم کے بانی محمد علی جناح	انگریزی	400/-	$-15
9	جناح اور ان کا دور (از عزیز بیگ)	انگریزی	250/-	$-10
10	مادر ملت سرمایہ ملت	اُردو	250/-	$-10
11	مادر ملت تصوری البم	اُردو	250/-	$-10
12	پاکستان ہینڈی کرافٹس	انگریزی	200/-	$-04
13	پاکستان کرونولوجی ۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۶ء (چھ جلدیں)	انگریزی	450/-	$-17
14	پاکستان کرونولوجی ۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۶ء (پیپر بیگ) (چھ جلدیں)	انگریزی	400/-	$-15
15	پاکستان دستکاریاں	انگریزی	250/-	
16	پاکستان، بنیادی حقائق	انگریزی	50/-	$-02
17	اُبھرتا پاکستان ایک طاہرانہ نظر	انگریزی	2000/-	$-120
18	پاکستان۔فرام ماؤنٹینز ٹو سی (محمد امین۔ڈنکن ویلٹس۔گراہم بینکاک)	انگریزی	1000/-	$-20
19	پاکستان چینی مصوروں کی نظر میں (ین پنگ اینڈ ژو ہوا)	انگریزی۔عربی۔فرانسیسی۔چینی	500/-	$-20
20	انڈس فیسز اینڈ ہولڈز	انگریزی	2500/-	$-125
21	چھ شہروں کے کتابچے	انگریزی	60/-	
22	دلفریب جھیلیں	انگریزی	200/-	$-12
23	ٹرک آرٹ	انگریزی	200/-	$-08
24	گندھارا آرٹ اِن پاکستان (از ڈاکٹر اے ایچ دانی)	انگریزی	100/-	$-04
25	مسلم آرٹ اینڈ ہیریٹج آف پاکستان (از ڈاکٹر اے ایچ دانی)	انگریزی	100/-	$-04
26	اسلامی معاشرتی اقدار	اُردو	15/-	$-01
27	وحدت افکار (علاقائی شاعری سے انتخاب)	اُردو	100/-	$-04
28	رحمت کا فرشتہ (عبدالستار ایدھی)	انگریزی	615/-	$-50
29	ماہِ نو غالب (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	500/-	$-60
30	ماہِ نو اقبال (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	350/-	$-17
31	ماہِ نو قائداعظم (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	500/-	$-60
32	ماہِ نو بیادِ فیض (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	500/-	$-60
33	ماہِ نو احمد فراز (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	500/-	$-60
34	ماہِ نو احمد ندیم قاسمی (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-60
35	ماہِ نو جالب نمبر (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	500/-	$-60
36	ماہِ نو جوش (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-60
37	ماہِ نو انتخاب والیم (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-60
38	ماہِ نو انتخاب ۲۰۱۸ء (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-60
39	ماہِ نو سر سید احمد خان (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-15
40	ماہِ نو منو بھائی (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-60
41	ماہِ نو اشفاق احمد (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-60
42	ماہِ نو بانو قدسیہ (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-60
43	ماہِ نو (ماہ نامہ) (گذشتہ شمارے)	اُردو	100/- فی شمار	
44	ماہِ نو (ماہ نامہ) (آن لائن)	اُردو		
45	پاک جمہوریت (ارفع کریم) (سپیشل ایڈیشن)	اُردو	10/-	
46	پاک جمہوریت (ماہ نامہ) (گذشتہ شمارے)	اُردو	100/- فی شمارہ	
47	پاک جمہوریت (ماہ نامہ) (آن لائن)	اُردو		
48	پاکستان پکٹوریل	انگریزی	200/-	$-120

رابطہ برائے خریداری

مینجر: ڈائریکٹوریٹ جنرل آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز، بی۔ایف بلڈنگ زیرو پوائنٹ، اسلام آباد، پاکستان۔فون: 051-9252182 فیکس: 051-9252176

DIRECTORATE OF ELECTRONIC MEDIA AND PUBLICATIONS

ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز، اسلام آباد

ریجنل آفس: 291 اے، ایم اے جوہر ٹاؤن لاہور۔